حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ

تصنیفی اور تجدیدی کارنامے

مقالہ نگار
محمد شکیل
فاضل 2021 جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑپکا
شریک کلیة الفنون 2022 جامعة الحسن ساہیوال

نگران اعلیٰ: مفتی ساجد الرحیم صاحب دامت برکاتہم العالیہ

نگران مقالہ: مولانا عبد الماجد عارفی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ

انتساب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمام تعریفیں اُس ذات کے لیے جس نے اِس کارخانۂ عالَم کو وجود بخشا۔ درود و سلام اللہ کے آخری پیغمبر ﷺ پر، جس نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

زیرِ نظر مقالہ "حضرت تھانویؒ کے تصنیفی و تجدیدی کارنامے کے عنوان سے معنون ہے اور میں اپنے اس مقالے کو اپنے مُشفق والدین اور اُن عزیزوں کے نام کرتا ہوں، جنہوں نے میری اِس کارِ خیر میں کسی بھی طرح کی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) معاونت کی، جن کی مخلصانہ جدوجہد، نیک تمناؤں اور دعاؤں کے طفیل، اللہ رب العزت نے اس خدمت کی توفیق بخشی۔ اللہ پاک انہیں دنیا و آخرت کی تمام خوشیاں، صحت وعافیت والی زندگی نصیب فرمائے اور اُن کا سایۂ عاطفت تادیر سلامت رکھے۔ آمین۔

اور میں اپنے اِس مقالے کی نسبت، جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑپکا، جو ملکِ پاکستان کی عظیم دینی درسگاہ اور میر امادرِ علمی ہے، جس کے آنگن میں، میں نے لکھنا پڑھنا سیکھا اور جامعۃ الحسن ساہیوال، جہاں اپنی مزید علمی تشنگی کو دور کرنے کے لیے آنا ہوا، جہاں کے علمی، تربیتی اور مطالعاتی ماحول سے ذوق و شوق حاصل کر کے، یہ مقالہ لکھنے کی سعادت نصیب ہوئی، اِن دونوں اداروں کی طرف بھی اس کی نسبت کرنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ اِن اداروں کو ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

اظہارِ تشکر

میں جامعۃ الحسن کے تمام اساتذہ کا بے حد شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس مقالہ کے لکھنے میں میری مدد اور حوصلہ افزائی فرمائی اور جن کی انتھک محنت اور تعلیم و تربیت اور نیک تمناؤں کی وجہ سے میں اس قابل ہوا کہ چند سطریں تحریر کرنے کی سعادت حاصل کر سکا، بالخصوص اپنے نہایت شفیق و مربی استاذ، شفیق الطلباء و محبوب الطلباء، حضرت مولانا مفتی محمد ساجد الرحیم صاحب اطال اللہ بقائہ کا بے حد مشکور ہوں، جنہوں نے ہمیں تعلیم و تربیت کا بہترین ماحول مہیا کیا اور اپنی اولاد سے بڑھ کر ہماری تربیت فرمائی اور دن رات اسی فکر میں لگے رہے کہ کسی طرح میرے بچے کامیاب ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ، حضرت استاذ جی کو اُن کے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے اور دارین کی سعادت نصیب فرمائے۔ آمین۔

اس کے ساتھ محترم و مشفق استاذ حضرت مفتی محمد عثمان غنی مدظلہ کا بھی مشکور ہوں کہ دورانِ مقالہ وہ مفید مشوروں اور نصیحتوں سے نوازتے رہے۔ نیز ناظمِ تعلیمات جامعہ ہٰذا، حضرت مفتی محمد ادریس صاحب مدظلہ کا بھی شکر گزار ہوں، جنہوں نے مقالہ لکھنے کی ترغیب دی اور وقتاً فوقتاً ہمارا حوصلہ بھی بڑھایا۔ (جَزَاهُ اللهُ خَيْرًا وَّاَحْسَنَ الْجَزَا) اور صحافت کے استاذ مولانا مفتی عبد الماجد عارفی مدظلہ کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنہوں نے مقالہ لکھنے میں بھرپور رہنمائی فرمائی اور اپنی نگرانی میں مقالہ لکھوایا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اساتذہ کرام کے علم و عمل میں برکتیں نصیب فرمائے اور اپنے شایانِ شان نعمتوں سے نوازے۔ آمین۔

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ	نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
1	سوانح حضرت تھانویؒ	4	12	یادداشت ضبط کرنے کا طریقہ	13
2	اساتذۂ کرام	5	13	حیوٰۃ المسلمین کی تصنیف	14
3	شرفِ بیعت	6	14	حضرت تھانویؒ کے تجدیدی کارنامے	15
4	معمولات	7	15	اصلاح بذریعہ خط وکتابت	16
5	اصلاحِ معاشرت	7	16	تصوُّف	16
6	قرآن وحدیث میں آدابِ معاشرت	8	17	اصلاحِ معاشرت (مجددانہ کارنامہ)	17
7	آداب	9	18	احکامِ اسلام کا دفاع	19
8	بات سننے کا ادب	10	19	تقلید	20
9	خلاصۂ آداب	11	20	پردہ	21
10	حضرت تھانویؒ کے تصنیفی کارنامے	11	21	پردہ کا عقلی ثبوت	23
11	تصانیف کی ضرورت واہمیت	12			

مقدمہ

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبیّ بعدہ۔اما بعد!

بے حد شکر اس ذات کا جس نے ہمیں ایمان کی دولت سے نوازا اور ہدایت کی راہ دِکھائی اور بے حد صلوٰۃ وسلام ہو سب نبیوں کے سردار، خاتم الانبیاء، حضرت محمد ﷺ پر اور آپ ﷺ کی آل پر اور اللہ تعالیٰ راضی ہو اُن کے چمکتے دمکتے قافلے کے ساتھیوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) سے اور اُن (بزرگوں) سے بھی راضی ہو، جنہوں نے نیکی کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی اتباع کی۔

اکابرینِ علماءِ دیوبند میں بہت سے بزرگ ایسے گزرے ہیں، جو علم کی ہر وادی میں داخل ہو جاتے تھے، جنہوں نے علم کو اپنا شِعار بنالیا تھا، نہ بھوک اُن کے سامنے رکاوٹ بنتی تھی، نہ پیاس، نہ گرمی اُکتاہٹ میں ڈالتی تھی نہ سردی، جنہوں نے دینِ حق کی اشاعت کے لیے اپنی جانوں کو وقف کر دیا تھا۔ اُن بزرگانِ دین میں سے، حضرت حکیم الامت، مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانویؒ، ان علماء میں سے تھے جو صحیح معنی میں حضور ﷺ کے وارث ہیں۔ حضرت والا، رُشد وہدایت کے مرکز اور علم وحکمت کے سرچشمہ تھے، انہیں خصوصاً امراضِ روحانی کی تشخیص اور اُن کے علاج میں وہ خداداد ملکہ حاصل تھا کہ اللہ رب العزت کی طرف سے حکیم الامتؒ کا لقب، عام طور سے قلوب میں القاء فرمادیا گیا۔(ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ،وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ)۔اس بناءپر، بندہ ناچیز نے چاہا کہ حضرت حکیم الامت، مجدد الملت کے چند واقعات و حالات، تصنیفی وتجدیدی کارناموں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ اس کا مقصد، اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہے، کیونکہ ہمارے دینی وعصری مدارس کی فضاء، مطالعے کے ذوق اور کتب بینی کے شوق سے خالی نظر آتی ہے اور بہت سے لوگ اِس قسم کی صورتحال سے دوچار نظر آتے ہیں گویا اُن میں سے ہر ایک، دوسرے سے کہہ رہاہے۔

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ ایسی کتابیں اور مقالات سامنے لائے جائیں، جو انسانی طبیعت کو علم کی طرف راغب کریں، اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں، قارئین کے سامنے، حضرت حکیم الامت، مجدد الملتؒ کے تصنیفی وتجدیدی کارنامے، مختصراً عرض کررہاہوں، اللہ تعالیٰ اسے اپنی بارگاہِ عالیہ میں قبول ومنظور فرمائے۔ آمین۔

آخر میں یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ میں ایک عامی شخص ہوں اور تالیف وغیرہ کا مجھے کوئی سلیقہ نہیں ہے، اس لیے قارئین سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ حضرت والا کے حالات وأفکار پر ہی نظر رکھیں، میری تحریر یا اس میں موجود اسلوب کی کجی یا قلم کے "کچے پن" کو نہ دیکھیں، کیونکہ مجھ جیسے نااہل کو، ایسے موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت ہی نہ ہوسکتی تھی، اس لیے کہ یہ منصب تو اہلِ علم کا تھا۔ لیکن اساتذہ کے حکم اور ان کی رہنمائی کے بھروسے پر چند سطریں سپردِ قرطاس کر دی ہیں۔ دعاہے کہ اللہ رب العزت، بندہ ناچیز کی ظاہری وباطنی کوتاہیوں کو معاف فرماکر، اس مقالے کو قبول فرمائے اور حضرت حکیم الامت، مجدد الملتؒ کے درجات بلند فرمائے اور سب مسلمانوں کو اُن کے فیض سے مستفید ومنتفع فرمائے۔ آمین۔

محمد شکیل

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تصنیفی وتجدیدی کارنامے

سوانح حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

نام محمد اشرف علی ہے۔ یہ نام حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس زمانے کے مقبول اور مشہور مجذوب تھے۔ حضرت والا کی ولادت سے پہلے ہی بطور پیشین گوئی تجویز فرمادیا تھا۔

ولادت

حضرت والا کی ولادت پانچ ربیع الثانی 1280ھ، بدھ کے دن بوقت صبح صادق ہوئی۔

پیدائش کا واقعہ

حضرت والا کی پیدائش کا واقعہ نہایت عجیب وغریب ہے جو خاندان میں اسی وقت سے چلا آرہا ہے، جس کو بعد میں خود حضرت والا نے اپنے بزرگوں اور حاضرین مجلس سے سن کر قلمبند فرمالیا تھا۔

واقعہ یہ ہے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد کو خارش کا مرض ہو گیا تھا اور اس قدر شدید تھا کہ کسی دوا سے فائدہ نہ ہوتا تھا۔ کسی ڈاکٹر نے کہا اس مرض کی دوا اکسیر ہے، مگر وہ قاطع النسل ہے۔ چونکہ والد صاحب مرض سے بہت تنگ آگئے تھے، اس لیے انہوں نے اس دوا کا استعمال کر لیا۔ والدہ صاحبہ کو یہ جب معلوم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئیں، کیونکہ اس وقت تک کوئی نرینہ اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔ جب یہ خبر نانی صاحبہ کو پہنچی تو وہ بڑی پریشان ہوئیں۔ انہوں نے حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتیؒ سے شکایت کی کہ حضرت میری اس لڑکی کے لڑکے زندہ نہیں رہتے۔ حافظ صاحب نے بطریق معمہ فرمایا کہ عمر اور علی کی کشاکشی میں مرجاتے ہیں۔ اب کی بار علی کے سپرد کر دینا، زندہ رہیں گے۔ اس مجذوبانہ معمہ کو کوئی نہ سمجھا، لیکن والدہ صاحبہ نے اپنی فہم خداداد اور نورِ فراست سے اس کا حل نکال لیا اور فرمایا کہ حافظ صاحب کا یہ مطلب ہے کہ لڑکوں کے باپ فاروقی ہیں اور ماں علوی اور اب تک جو نام رکھے گئے ہیں وہ باپ کے نام پر تھے، اب کی بار ننھیال کے ناموں کے مطابق رکھا جائے، جس کے آخر میں علی ہو۔ حافظ صاحب یہ سن کر ہنسے اور فرمایا کہ واقعی میرا یہی مطلب تھا، یہ لڑکی بہت عقلمند معلوم ہوتی ہے۔ پھر فرمایا کہ اس کے ان شاء اللہ دو لڑکے ہوں گے، دونوں زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی دوسرے کا نام اکبر علی رکھنا اور یہ بھی فرمایا کہ ایک میرا ہو گا وہ مولوی ہو گا اور حافظ ہو گا، دوسرا دنیادار ہو گا۔ چنانچہ یہ سب پیشین گوئیاں حرف بحرف درست نکلیں۔

حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو میں کبھی کبھی اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں، ان ہی مجذوب صاحبؒ کی روحانی توجہ کا اثر ہے جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں، کیونکہ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے الجھی ہوئی باتوں کی متحمل نہیں۔

(اشرف السوانح: 1/43، تالیفاتِ اشرفیہ)

لقب گرامی: حضرت والا کا لقب گرامی، حکیم الامت ہے۔ جو ایک عرصہ دراز سے حق تعالیٰ نے قلوبِ خواص وعوام میں القاء فرمادیا ہے۔ اور یہ لقب سب سے پہلے جناب مولوی مرزا محمد بیگ صاحب مرحوم نے حضرت والا کے پتہ میں تحریر فرمایا تھا، اس کے بعد خود بخود نہ معلوم کس طرح زبان زدِ خاص وعام ہو گیا۔

شرفِ نسب:

حضرت والا کا دڈھیال فاروقی اور ننھیال علوی ہے۔ والد ماجد کا نام گرامی "عبد الحق" ہے۔ آپ قصبہ تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر کے ایک رئیس اور صاحبِ نقد و جائید اد تھے اور باقاعدہ قاری تو نہ تھے، لیکن مخارج بہت صحیح تھے اور حافظ تو نہ تھے، لیکن ناظرہ ایسا رواں تھا کہ بعض اوقات حافظ کو بھی لقمہ دے دیا کرتے تھے۔ نیز حضرت تھانویؒ کے جدِ اعلیٰ، حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی عقل و فراست تو مسلّماتِ عالم میں سے ہے۔ عقل کی دولت تو حضرت والا کو دڈھیال سے ملی اور عشق کی دولت ننھیال سے پہنچی، جو پیر زادوں کا ایک مشہور خاندان ہے۔ حضرت والا کے ننھیال کے جدِ اعلیٰ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شانِ علمی و عشقی مسلّم الثبوت ہے۔

وطن:

حضرت والا کا وطن "تھانہ بھون" تھا، جو ضلع مظفر نگر میں واقع ہے۔ اصل نام "تھانہ بھیم" تھا، کیونکہ وہ کسی زمانہ میں راجہ بھیم کا تھانہ تھا، لیکن گزرتے زمانے کے ساتھ تھانہ بَھوَن ہو گیا۔ یہ اہلِ علم و دانش کی سرزمین ہے، یہاں کے عقلاء خاص طور پر مشہور رہے ہیں۔ چنانچہ ایک انگریز افسر نے اپنی رپورٹ میں مختلف قصبات کے باشندگان کے متعلق اظہارِ رائے کرتے ہوئے تھانہ بھون کے باشندوں کو "عاقلانِ تھانہ" کا لقب دیا تھا۔ چنانچہ قنوج کے شیخ معشوق علی صاحبؒ جو ایک دین دار بزرگ اور نہایت عاقل اور مردم شناس رئیس تھے، انہوں نے حضرت تھانویؒ سے ایک بار فرمایا کہ ان اطراف کے لوگ، ہماری طرف کے لوگوں سے ہر بات میں بڑھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہاں کا عالم وہاں کے عالم سے اچھا ہے، یہاں کا جاہل وہاں کے جاہل سے اچھا ہے، حتیٰ کہ یہاں کا کافر وہاں کے کافر سے اچھا ہے۔

حضرت والا کی تربیت اور اوصاف

حضرت والا کی عمر ابھی پانچ سال ہی تھی کہ والدہ مُشفقہ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا اور پھر والد صاحب نے بڑی محبت اور شفقت سے دونوں بھائیوں کو اپنے ہاتھوں پرورش کیا۔ ایسی محبت سے پالا کہ والدہ صاحبہ کے رنج کو بھی بھلا دیا۔ حضرت والا کے والد ماجد، احسن درجے کی تربیت کیا کرتے تھے اور اخلاق کی بہت نگہداشت رکھتے تھے۔۔۔۔ خود حضرت والا اعلیٰ درجے کی ذہانت کے مالک تھے۔ عبادت کا شوق بچپن سے تھا اور وعظ کا شوق بھی بچپن ہی سے تھا۔ حضرت اقدس جناب مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے ایک بار حضرت تھانویؒ کے متعلق اپنے ایک خادم سے فرمایا تھا کہ مجھے تو اُن سے اس وقت سے محبت ہے جب وہ مجھے جانتے بھی نہ تھے۔ غرض حضرت والا بچپن ہی سے بزرگانِ دین کے محبوب اور منظورِ نظر تھے۔ حضرت پر ابتداءِ عمر ہی سے آثارِ سعادت اور مقبولیت عند اللہ کا ظہور ہونے لگا تھا۔

اساتذۂ کرام

حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت تھانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے اساتذہ کرام بھی ایسے عطا فرمائے تھے کہ اُن میں سے ہر ایک اپنی جگہ غزالی اور رازیِ وقت تھا۔ اُن میں سب سے زیادہ مقتدر ہستی، حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی تھی، جو ہر فن میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے صاحبِ باطن اور شیخ کامل بھی تھے اور انہی سے حضرت والا متاثر بھی تھے۔

دیگر اساتذۂ کرام رحمۃ اللہ علیہم:

دیگر اساتذۂ کرام میں جناب مولانا سید احمد صاحبؒ، جناب مُلا محمود صاحبؒ، جناب مولانا عبد العلی صاحبؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ہیں۔ فنِ تجوید حضرت والا نے مشہورِ زمانہ، جناب قاری محمد عبد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے مکہ معظمہ میں حاصل کیا، جو عرب قراء کے نزدیک بھی جید اور ماہرِ فن تسلیم کیے جاتے تھے۔

حضرت والا نے حفظِ قرآن زیادہ تر حافظ حسین علی صاحب مرحوم سے کیا، فارسی کی متوسطات، حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ سے پڑھیں اور اپنے ماموں واجد علی صاحبؒ سے بھی پڑھا، پھر تحصیلِ عربی کے لیے دیوبند تشریف لے گئے تھے اور دیوبند میں ہی عربی کی تکمیل ہوئی اور وہاں پانچ سال طالب علم رہنا ہوا اور 1301ھ کے شروع میں فارغ التحصیل ہو گئے۔

درس و تدریس:

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد، اُسی سال (صفر 1301ھ بمطابق 1883ء میں) آپؒ تدریس کے لیے مدرسہ فیضِ عام کانپور تشریف لے گئے، جو سنِ قیام کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند سے بھی قدیم مدرسہ تھا۔ حضرت والا اس وقت بالکل نوجوان تھے، لیکن کانپور پہنچ کر وہاں کے جملہ (تمام) مدرسین اور اہلِ شہر میں بہت جلد شہرت ہو گئی اور ہر دلعزیز ہو گئے۔

کانپور میں آپؒ کے تلامذہ:

کانپور میں آپؒ نے چودہ (14) سال قیام فرمایا اور سینکڑوں طلبہ آپؒ کے دریائے علم سے فیض یاب ہوئے، ان میں مولانا اسحاق بردوانیؒ، مولانا رشید احمد کانپوریؒ، مولانا احمد علی فتح پوریؒ، علامہ ظفر احمد عثمانی تھانویؒ، مولانا صادق الیقین کرسویؒ، مولانا شاہ لطف الرسول بارہ بنکویؒ، مولانا مظہر الحق چاٹگامیؒ، مولانا مظہر علی خان تھانویؒ اور مولانا فضل الحق الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہم سر فہرست ہیں۔

شرفِ بیعت:

شیخ العرب والعجم شیخ المشائخ حضرت حاجی شاہ امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت سے بڑے بڑے علماء، بلکہ دوسرے سلسلوں کے مشائخ نے بھی شرفِ بیعت حاصل کرنے کو اپنا فخر سمجھا، لہٰذا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایسا محقق اور جامع شریعت شیخ، اس زمانے میں کوئی نہیں گزرا۔ حضرت والا بھی انہیں اخص الخواص لوگوں میں سے تھے جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ غلامی میں داخل تھے۔

حضرت والا ابھی مدرسہ دارالعلوم دیوبند میں طالب علم تھے کہ اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا کے والد ماجد کو مکہ معظمہ سے کہلا بھیجا تھا کہ تم حج کو آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو بھی اپنے ساتھ لیتے آنا، تو جب حج کے لیے جانا ہوا تو حضرت والا بھی سفرِ حج کے لیے تیار ہو گئے اور سفر میں بڑی مشکلات پیش آئیں اور سمندری سفر اس زمانے میں خطرناک تھا، سمندر میں طغیانی تھی، لیکن حضرت والا فرماتے ہیں کہ چونکہ اللہ کی راہ میں جا رہے تھے، اس لیے وحشت اور پریشانی بالکل نہیں تھی۔ بالآخر حضرت والا اپنے والد ماجد کے ساتھ بخیر و عافیت مکہ معظمہ حاضر ہو گئے۔

دست بدست بیعت:

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حج سے پہلے ہی خط کے ذریعے حضرت والا کو بیعتِ غائبانہ سے مشرف فرما لیا تھا، پھر مکہ معظمہ تشریف لائے تو دست بدست (ہاتھ میں ہاتھ لے کر) بھی بیعت کا شرف بخش دیا اور حضرت والا کے والد ماجد بھی اسی سفر میں حضرت حاجی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف کی تشہیر و اشاعت، جیسی حضرت والا کی ذات سے ہوئی، ویسی اشاعت کسی اور سے ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ خود حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کئی مرتبہ حضرت والا سے فرمایا کہ بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو اور اگر دورانِ تقریر حاضرین میں سے کوئی سوال کرتا، تو حضرت والا کی طرف اشارہ فرمادیتے کہ ان سے پوچھ لینا، یہ خوب سمجھ گئے ہیں۔

(اشرف السوانح:1/232، تالیفاتِ اشرفیہ)

معمولات

گھر میں داخل ہونے کے معمولات:

حضرت والا جب اپنے گھر تشریف لے جاتے تھے تو ہمیشہ یہ معمول تھا کہ پہلے کنڈی کھٹکھٹاتے، پھر کسی کا نام لے کر پکارتے اور جب تک اندر سے بلایا نہیں جاتا، انتظار میں کھڑے رہتے تھے اور اگر کوئی بچہ بلائے، تو کافی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ جب تک کوئی بڑا نہ بلائے، اندر تشریف نہیں لے جاتے تھے۔ کسی کے گھر پہلے سے پردہ بھی ہوتا تھا تو احتیاطاً فرماتے کہ دوبارہ دیکھ لیا جائے پردہ ہے یا نہیں؟

سفارش کرنے میں معمول:

حضرت والا عموماً کسی کی سفارش نہیں فرماتے تھے، کیونکہ اس سے اکثر مخاطب کو تنگی ہوتی تھی۔ اگر کسی کے لیے سفارش فرماتے تو جس سے سفارش فرماتے، اس کو پوری آزادی دے دیتے اور اس قسم کی قیدیں لگا دیتے، مثلاً: "بشرطیکہ کسی قسم کی تنگی نہ ہو اور کسی مصلحت کے خلاف بھی نہ ہو اور کسی کی حق تلفی بھی نہ ہو" جن سب کا حاصل یہ تھا کہ مخاطب کو تنگی نہ ہو۔

مباح امور میں رائے سے پرہیز:

عموماً مباح امور میں کسی کو رائے نہیں دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ رائے تو اہلِ تجربہ سے لی جائے، میں دعا کرتا ہوں۔ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ رائے دینے والے کو نتیجہ کا ذمہ دار سمجھتے ہیں اور اگر نتیجہ مرضی کے خلاف ہوتا ہے تو الزام دیتے ہیں، حالانکہ حقیقت تو صرف یہ ہے کہ رائے دینے سے دوسرے کو اس کام میں سہولت ہو جائے اور معاونت ہو جائے، باقی رائے خود ہی قائم کرنی چاہیے۔

- ❖ ہر چیز کو اپنی جگہ پر نہایت سلیقے سے رکھتے، تاکہ جس نے پہلے رکھی ہے اسے ڈھونڈنے میں دشواری نہ ہو۔
- ❖ دوسرے کی چیز فوراً واپس کر دیتے تھے اور برتن (کٹورے، گلاس وغیرہ) کو استعمال کے بعد اُلٹا رکھتے تھے، تاکہ وہ خراب نہ ہو جائے۔
- ❖ اپنے عزیزوں کے گھروں میں بھی اس وقت تشریف لے جاتے تھے، جب اُن گھروں میں کوئی محرم مرد یا شوہر بھی ہو۔
- ❖ ہر امانت کو جدا جدا رکھتے تھے، کیونکہ خلط ملط ہونے کی صورت میں شرعاً احکام بدل جاتے ہیں اور پھر امانت، امانت نہیں رہتی بلکہ قرض ہو جاتی ہے۔
- ❖ حضرت والا کو ہر معاملے کے وقت، اس کے متعلق شرعی احکام سب سے پہلے مستحضر ہو جاتے تھے اور ایسی باریک جزئیات تک فوراً نظر پہنچ جاتی تھے، جن کی طرف آج کل عموماً کسی کی توجہ نہیں جاتی۔

(اشرف السوانح:1/32، تالیفاتِ اشرفیہ)

اصلاحِ معاشرت:

حضرت والا نے حکیم الامت اور مجدد الملت ہونے کی حیثیت سے اصلاحِ معاشرت جیسے ضروری شعبے کی اصلاح اس قدر اہتمام اور تفصیل سے فرمائی ہے کہ اِس کی جانب ایسی خاص توجہ، صدیوں سے نہ ہوئی ہوگی۔

"چنانچہ ایک بار خود فرمایا کہ مجدد الملت تو خیر کیا، لیکن میں مجددِ معاشرت ضرور ہوں"۔ (اشرف السوانح:1/43۔ تالیفاتِ اشرفیہ)

حضرت والا ملامت کی پرواہ کیے بغیر، دن رات لوگوں کو نہایت اہتمام کے ساتھ روک ٹوک فرماتے رہتے تھے، طعنوں کی پرواہ بالکل نہیں فرماتے تھے، حضرت والا کے ہاں سب سے مقدم تعلیم، اصلاحِ معاشرت ہی کی ہوتی تھی۔ اس لیے ہر ہر کوتاہی کی قولی و عملی تعلیم وتربیت فرماتے رہتے تھے۔

معاشرت کی تعلیم نہ ہونے کا نقصان:

اس وقت دین کے پانچ اجزا میں سے عوام نے تو صرف دو ہی اجزاء کو دین سمجھا ہے، یعنی عقائد و عبادات کو۔ علماء ظاہر نے تیسرے جز کو بھی دین اختیار کیا ہے، یعنی معاملات کو، اور مشائخ نے چوتھے جز کو بھی دین قرار دیا ہے، یعنی اخلاقِ باطنی کی اصلاح کو، لیکن ایک پانچویں جز کو جو کہ آدابِ معاشرت ہے، تقریباً ان تینوں طبقوں نے دین سے خارج اور بے تعلق قرار دے رکھا ہے، الا ماشاءاللہ۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک باہمی الفت واتفاق میں جو کمی ہے، اس کا بڑا سبب یہ سوءِ معاشرت (خراب برتاؤ) بھی ہے۔

قرآن وحدیث میں آدابِ معاشرت:

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں دوسرے کے لئے گنجائش پیدا کرو، تو گنجائش پیدا کر دیا کرو، اللہ تمہارے لیے وسعت پیدا کرے گا اور جب کہا جائے اٹھ جاؤ، تو اٹھ جاؤ"۔ (مجادلہ:11)

دیکھیے! اس میں اپنے جلیسوں (ساتھ بیٹھنے والے) کی راحت کی رعایت کا کس طرح حکم فرمایا ہے۔

" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ مہمان کے لیے حلال نہیں کہ میزبان کے پاس اس قدر قیام کرے کہ وہ تنگ ہو جائے۔" (صحیح مسلم:2/90،م:رحمانیہ)

غور کریں! اس میں ایسے امر سے ممانعت ہے، جس سے دوسروں کے دل پر تنگی ہوتی ہے۔

"آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کے ساتھ کھانے کے وقت، چاہے پیٹ بھر جائے، مگر جب تک دوسرے لوگ فارغ نہ ہو جائیں، ہاتھ نہ اٹھائیں۔ کیونکہ اِس سے دوسرا کھانے والا شرما کر ہاتھ اٹھالیتا ہے اور شاید اُسے کھانے کی حاجت باقی ہو۔" (ابن ماجہ:370،م:رحمانیہ)

اس سے ثابت ہوا کہ ایسا کام نہ کیا جائے، جس سے دوسرا آدمی شرما جائے۔ بعض آدمی طبعی طور پر مجمع میں کسی چیز سے شرماتے ہیں اور انہیں پریشانی ہوتی ہے، اُن سے مجمع میں کوئی چیز مانگو، تو انکار اور عذر کرنے سے شرماتے ہیں، یعنی مجمع میں لینے کو جی چاہتا ہے اور دینے کو جی نہیں چاہتا، ایسے شخص کو مجمع میں نہ دیا جائے، نہ مجمع میں اس سے مانگا جائے۔

"حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور ﷺ سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہ تھا، مگر آپ ﷺ کو دیکھ کر اس لیے نہیں کھڑے ہوتے تھے، کہ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ کو ناگوار ہوتا ہے۔" (سنن الترمذی:2/564،م:رحمانیہ)

اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ اگر کوئی خاص ادب و تعظیم یا کوئی خاص خدمت، کسی کے مزاج کے خلاف ہو تو اس کے ساتھ وہ معاملہ نہ کیا جائے، اگرچہ اپنی خواہش ہو، مگر دوسرے کی خواہش کو مقدم رکھا جائے۔ بعض لوگ بعض خدمات میں اصرار کرتے ہیں، جن سے بزرگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

"ایک صحابی (کلدہ بن حنبل رضی اللہ عنہ) ایک ہدیہ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، بغیر سلام کیے اور بغیر اجازت کے داخل ہو گئے، آپ ﷺ نے فرمایا: باہر جاؤ "السلام علیکم، کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں؟" کہہ کر پھر آؤ۔" (سنن ابی داود:2/362،م رحمانیہ)

اِن سب احادیث سے جو بات سمجھ آئی ہے، وہ در حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی بنیاد ایک ہی کام میں ہے، کہ کسی قِسم کی تکلیف اور ایذا نہ پہنچائی جائے، جیسے حضور ﷺ نے نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

"اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ" ترجمہ: کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے (دوسرے) مسلمان محفوظ رہیں۔

(صحیح بخاری: 1/62، م: رحمانیہ)

حاصل یہ ہے کہ جس چیز سے اذیت ہو چاہے وہ مالی خدمت کی صورت میں ہو یا بدنی خدمت کی صورت میں ہو، یا ادب و تعظیم کی صورت میں ہو، یہ اگرچہ اچھی عادات ہیں، لیکن اگر اذیت کا سبب ہوں تو سب سوءِ خلق (بری عادت) میں داخل ہیں، اس لیے کہ راحت، خدمت پر مقدم ہوتی ہے۔

قرآن وحدیث میں متفرق جگہوں پر آدابِ معاشرت کا ذکر آیا ہے، ان کو اخذ کر کے یکجا کرنا، پھر ان پر عمل کرنا اور کروانا حضرت تھانویؒ کا خاصہ ہے، اُن میں سے چند آداب کا ذکر کیا جاتا ہے، دعا ہے کہ اللہ رب العزت توفیقِ عمل نصیب فرمائے۔ آمین۔

آداب

کسی کے پاس بیٹھنے کا ادب:

کسی کے پاس بیٹھنا ہو تو اِس قدر مِل کر نہ بیٹھو، کہ اس کا دل گھبرانے لگے اور نہ اِس قدر فاصلہ سے بیٹھو کہ بات چیت کرنے میں تکلیف ہوتی ہو۔

کسی کی خدمت کرنے کا ادب:

بعض اوقات کوئی خدمت، کسی دوسرے سے لینا اچھا نہیں لگتا۔ اس لیے ایسی خدمت پر اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ مخدوم کو راحت کے بجائے تکلیف ہوتی ہو اور یہ بات اس مخدوم کی صراحتاً ممانعت سے یا قرائن (علامات) سے معلوم ہو جاتی ہے۔

مشغول آدمی کی رعایت:

مشغول آدمی کے پاس بیٹھ کر اس کو تکنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ اس سے توجہ تقسیم ہو جاتی ہے اور دل پر بوجھ معلوم ہوتا ہے، بلکہ خود اس کی طرف متوجہ ہو کر بھی مت بیٹھو۔

میزبان کو کھانا نہ کھانے کی اطلاع:

کسی کے پاس مہمان جانا ہو اور کھانا کھانے کا دل نہ چاہ رہا ہو، چاہے اس وجہ سے کہ کھا چکا ہو یا روزہ ہو یا کسی وجہ سے کھانے کا ارادہ نہ ہو، تو فوراً جاتے ہی اس کو اطلاع کر دو کہ میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا، ایسا نہ ہو کہ وہ انتظام کرے اور اس کو مشقت بھی ہو، پھر کھانے کے وقت اسے اطلاع کرو، تو اس کا سب اہتمام وطعام تو ضائع ہو گیا۔

کسی سے اپنا کام کہنے کا ادب:

کوئی حاجت لے کر کہیں جاؤ، تو جب موقع ملے فوراً اپنی ضرورت یعنی آنے کا مقصد بتلا دو۔ آدمی پوچھتا ہے تو کہتے ہیں کہ صرف ملنے آئے ہیں، بس ویسے آئے ہیں۔ جب وہ بے فکر ہو جاتا ہے اور موقع بھی نہیں ہوتا تو پھر اُسے کہا جائے کہ آپ سے کچھ کہنا ہے، جی تھوڑا کام ہے، تو اس وجہ سے بڑی اذیت ہوتی ہے اور پریشانی ہوتی ہے۔

اجتماعی چیز کے استعمال کا ادب:

کوئی چیز کئی لوگوں کے استعمال میں آتی ہو، تو جو شخص اُس سے کام لے تو فوراً کام کرنے کے بعد، جس جگہ سے اٹھائی تھی وہاں رکھ دینی چاہیے، اس کا اہتمام کیا جائے۔

رضامندی کے بغیر کسی کا کھانا نہ کھاؤ:

جو شخص کھانے کے لیے جارہا ہو، یا کسی نے اُسے دعوت دی ہو تو اس کے ساتھ اس جگہ نہیں جانا چاہیے، جہاں کھانے کا انتظام ہو۔ کیونکہ صاحبِ خانہ (میزبان) شرم کی وجہ سے ساتھ والے کو بھی بلالیتا ہے اور دل سے نہیں چاہتا۔ بعض لوگ جلدی قبول بھی کرلیتے ہیں، تو اِس صورت میں میزبان کی رسوائی ہوئی اور اس کے علاوہ میزبان شروع شروع میں تردد (شش وپنج) میں بھی مبتلا ہوگا، یہ مستقل تکلیف ہے۔ اس لیے رضامندی کے بغیر کھانا نہیں کھانا چاہیے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ کا ایک ہمسایہ تھا جو کہ فارسی تھا، وہ شوربہ بہت عمدہ بناتا تھا، اس نے رسول ﷺ کے لیے کھانا بنایا، پھر وہ آپ ﷺ کو بلانے کے لیے حاضرِ خدمت ہوا تو آپ ﷺ نے (حضرت عائشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا اوران کی دعوت بھی؟ تو اس نے کہا نہیں۔ رسول ﷺ نے فرمایا: نہیں (یعنی میں بھی دعوت میں نہیں آتا) وہ دوبارہ آیا، آپ نے پھر حضرت عائشہ کی طرف اشارہ کیا، تو صحابی نے عرض کیا نہیں، الغرض تیسری مرتبہ صحابی نے عرض کیا، جی ہاں! ان کی بھی دعوت ہے، پھر وہ دونوں (حضرت عائشہ اور رسول ﷺ) کھڑے ہوئے اور چلے، یہاں تک کہ اس کے گھر میں آگئے۔ (صحیح مسلم: 2/178، مکتبۃ الحسن)

تیزی سے جانے والے سے مصافحہ:

جو آدمی تیزی کے ساتھ جارہا ہو، راستے میں اُس سے مصافحہ نہیں کرنا چاہیے، ہو سکتا ہے اسے کوئی ضروری کام ہو اور نہ ہی ایسے وقت میں اُسے روکنا مناسب ہے کہ باتیں کرنے لگ جاؤ، اس سے بھی اذیت ہوتی ہے۔

مجلس میں ہر ایک سے مصافحہ:

بعض آدمی مجلس میں جاتے ہیں تو ہر ایک سے الگ الگ مصافحہ کرتے ہیں، اگرچہ سب سے تعارف نہ ہو، جس میں کافی وقت صرف ہوتا ہے اور تمام مجلس مشغول اور پریشان رہتی ہے۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ جس کے پاس آنے کا مقصد ہے اس سے مصافحہ کرو باقیوں سے نہیں، البتہ اگر دوسروں سے بھی جان پہچان ہے تو کوئی حرج نہیں۔

بات کو صاف طریقہ سے کہنا:

بعض آدمی آدھی بات بلند آواز سے کہتے ہیں اور آدھی بالکل آہستہ، جو سنائی ہی نہیں دیتی یا ادھوری سنائی دیتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ممکن ہے کہ سننے والا غلط فہمی، تردد، الجھن میں پڑ جائے اور نتیجہ پھر ناگوار ہوتا ہے۔ بات کے ہر ہر جز کو بہت صاف کہنا چاہیے۔

بات سننے کا ادب:

بات کو اچھی طرح توجہ سے سننا چاہیے، اگر کچھ شبہ رہے تو بات کرنے والے سے فوراً دوبارہ تحقیق کرلے، بغیر سمجھے محض اجتہاد سے یعنی اپنی طرف سے مطلب نہ نکالے، بعض اوقات غلط فہمی کے ساتھ عمل کرنے کی صورت میں متکلم کو سخت اذیت کا سامنا کرنا پڑجاتا ہے، اس لیے توجہ سے بات سننی چاہیے۔

بات کا جواب صاف دینا:

ایک شخص سے پوچھا گیا کہ کب جاؤ گے، اُس نے جواب دیا کہ جب حکم ہو، اس پر تعلیم دی گئی کہ یہ جواب مہمل (واضح نہیں) ہے، مجھے کیا پتا آپ کی حالت کیسی ہے، آپ کے پاس کتنا وقت ہے، آپ کو چاہیے کہ یوں جواب دیں کہ اپنا ارادہ بھی بتادیں یعنی ادب

واطاعت کے ساتھ کہہ دیں، کہ میرا ارادہ اس طرح ہے، آگے جیسے آپ حکم فرمائیں۔ اس سے سہولت ہو جاتی ہے، پوچھنے والے پر بھی اور بتانے والے پر بھی۔

مجلس کی گفتگو میں مداخلت کرنا:

اگر مجلس میں کوئی خاص گفتگو ہو رہی ہو، تو نئے آنے والے کو چاہیے کہ وہ سلام کر کے اپنی طرف متوجہ نہ کرے، اس سے گفتگو میں خلل آئے گا اور نہ ہی درمیان میں بات کر کے خلل ڈالے، بلکہ چاہیے کہ چپکے سے نظر بچا کر بیٹھ جائے، پھر جب موقع ملے تو سلام وغیرہ کر لے۔

پیش کی ہوئی چیز کی وضاحت:

ایک شخص نے کچھ آٹا لا کر رکھ دیا کہ یہ لایا ہوں اور یہ نہیں بتایا کہ کس کے لیے لایا ہوں، اُسے چاہیے تھا کہ وہ وضاحت کر دیتا کہ جامعہ کے لیے ہے یا فلاں شخص کے لیے ہے۔ الحاصل واضح کر دینا چاہیے کہ یہ چیز کس لیے دی گئی ہے۔

سفارش کرنے کا طریقہ:

آج کل سفارش جبر واکراہ ہے کہ اپنے منصب اور شخصیت کی بنیاد پر دوسروں پر زور ڈالتے ہیں، جو شرعاً جائز نہیں۔ اگر سفارش کرنی ہو تو اس طرح سے کرو کہ مخاطب کو مکمل آزادی ہو اور اختیار ہو، چاہے وہ عمل کرے نہ کرے، یہ صورت شرعاً جائز ہے، بلکہ ثواب بھی ہے۔

بیمار کو مایوس نہ کرو:

بیمار کے سامنے یا اس کے گھر والوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہییں، جن کی وجہ سے تکلیف ہو، نا امیدی پیدا ہو، بلا وجہ دل ٹوٹے گا، بلکہ تسلی کی باتیں کریں کہ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا، دکھ ختم ہو جائے گا وغیرہ۔

اشارے سے بات نہ کرو:

اگر کسی کی پوشیدہ بات کرنی ہو اور وہ بھی اس جگہ موجود ہو، تو آنکھ سے یا ہاتھ سے اُدھر اشارہ نہیں کرنا چاہیے، اس سے وہ شبہ میں پڑ جائے گا، یہ تو تب ہے جب وہ بات شرعاً درست ہو، اگر درست نہ ہو تو ایسی بات کرنا ہی گناہ ہے۔

مہمان تھوڑا سا کھانا بچا دے:

مہمان کو چاہیے کہ اگر پیٹ بھر جائے تو تھوڑا سا سالن روٹی، دستر خوان پر ضرور چھوڑ دے، تا کہ گھر والوں کو یہ شبہ نہ ہو کہ مہمان کے لیے کھانا کم ہو گیا، اس سے میزبان کو شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔

بغیر تحقیق کے بات نہ پھیلاؤ:

بغیر تحقیق کے کوئی بات آگے نہیں پھیلانی چاہیے، خصوصاً کسی کے غم کی خبر سنو تو تحقیق کرنے سے پہلے کسی سے نہ کہو، خصوصاً اس کے عزیزوں سے نہ کہو، بعض اوقات نتیجہ ناگوار ہوتا ہے۔

خلاصۂ آداب:

اِن تمام آداب کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے کسی قول یا فعل یا حال سے دوسرے کی طبیعت پر کوئی تنگی اور پریشانی نہیں ڈالنی چاہیے، بس حسن اخلاق کا یہی خلاصہ ہے۔ جو اس قاعدے کو سمجھ کر عمل میں لے آئے، تو اُسے زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اسی لیے اس فہرست کو بڑھایا نہیں گیا۔ البتہ اس قاعدے کے لحاظ کے ساتھ ساتھ اتنا کام اور کرنا پڑے گا کہ ہر قول و فعل سے پہلے ذرا یہ سوچنا ہو گا کہ میری

یہ حرکت کسی کے لیے ایذا کا سبب تو نہیں ہوگی۔ پھر غلطی بہت کم ہوگی اور چند دنوں کے بعد طبیعت ایسی ڈھل جائے گی کہ سوچنا بھی نہیں پڑے گا اور طبعی طور پر یہ سارے کام ہوتے چلے جائیں گے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تصنیفی کارنامے

کتابوں کی ضرورت واہمیت ہر زمانے میں رہی ہے۔ انسان تو چلا جاتا ہے، لیکن وہ اپنے خیالات اور اپنی باتیں نقوش (کتابوں) کی صورت میں چھوڑ جاتا ہے، جو صدیوں تک پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔ موجودہ زمانہ، ڈیجیٹل زمانہ ہے، جس میں ہر بات خواہ دینی ہو یا دنیوی، فوراً دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ بہت زیادہ اور تیز ہیں، لیکن اس کے باوجود کتابوں نے اپنا مقام نہیں کھویا، آج بھی کتابوں کے ذریعے دین کے احکام، دین کی تبلیغ جاری ہے، آج بھی کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا جاتا ہے، آج بھی کتابوں کی افادیت میں کوئی کمی نہیں آئی، اس قدر وسائل کے باوجود یہ کتابیں لائبریریوں، درس گاہوں، گھروں، دفتروں کی زینت بنی ہوئی ہیں، ان کی اہمیت اب بھی باقی ہے۔

آج سے ایک صدی پہلے، جس زمانے میں انٹرنیٹ کا تصور بھی نہیں تھا، ڈیجیٹل زمانہ نہیں تھا، اس وقت کتابوں کی اہمیت کس قدر زیادہ ہوگی، جس زمانے میں ایک چھوٹی سی بات پہنچانے کے لیے بھی تحریر کی ضرورت ہوا کرتی تھی، تو دین کے احکام ومسائل جو کہ انتہائی ضروری ہیں، اُن کی تبلیغ کرنا اِن کتابوں اور تحریروں کے بغیر کیسے ممکن تھا، اُس وقت تصنیفی حوالے سے کام کرنے کی کس قدر ضرورت تھی، لوگ اس کام کے کتنے محتاج تھے۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس نہج پر بھی کام کیا اور امتِ محمدیہ کی اِس ضرورت کو پورا کیا اور دین کو اصلی صورت میں پیش کیا۔

تصانیف کی ضرورت واہمیت:

حضرت والا کی مجلس میں جو طالبین آتے تھے وہ تو حضرت کے ملفوظات اور دین کے احکام ومسائل کی روشنی سے مستفید ہوتے تھے، اُن کی پیاس تو بجھ جاتی تھی، لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو حضرت والا کی مجلس میں شریک نہیں ہوسکتے تھے، حضرت والا کے علم سے فیض یاب نہیں ہوسکتے تھے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر حضرت والا نے دین کی اشاعت، تحریر کے ذریعے کرنے کا عزم کیا اور عوام وخواص سب کے لیے مفید ترین تصنیفات کا ذخیرہ پیش کیا۔ دین کا کوئی ضروری شعبہ ایسا نہیں ہے، جس پر حضرت والا کی تصنیف موجود نہ ہو۔ حضرت والا جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے، تو اس کا کوئی ضروری پہلو نظر انداز نہیں ہوتا تھا اور اس موضوع پر نہایت مکمل اور دلیل سے بحث فرماتے تھے۔

حضرت والا کے مضامین دل میں اترتے چلے جاتے ہیں، خود حضرت والا نے اس کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ میری شروع ہی سے یہ نیت ہوتی ہے کہ بس سچی سچی باتیں لکھوں اور میں سچی سچی باتیں لکھتا بھی ہوں، اسی لیے وہ عموماً دل کو لگ جاتی ہیں، کیونکہ حدیث میں ہے کہ

"فَإِنَّ الصِّدْقَ طُمَأْنِينَةٌ وَالْكَذِبَ رِيبَةٌ"۔ ترجمہ: سچائی اطمینان کا باعث ہے اور جھوٹ شک میں ڈالتا ہے۔ (سنن الترمذی: 2/78، قدیمی کتب خانہ)

(اشرف السوانح: 1/79، تالیفاتِ اشرفیہ)

مقبولیتِ عامہ:

حضرت والا کی تصانیف، اللہ کے فضل سے اِس قدر مقبول ہوئیں کہ کسی مصنف کی حیات میں شاید ہی اُس کی تصانیف اتنی مقبول ہوئیں ہوں۔ چنانچہ حضرت والا کی زندگی میں بعض تصنیفات تو ہزاروں کی تعداد میں چھپ چکی تھیں، مشرق ومغرب تک پہنچی ہوئیں تھیں اور اب ان کی تعداد بلا مبالغہ لاکھوں تک جا پہنچی ہے۔ بعض کتابیں اب بھی گھر گھر پائی جاتی ہیں، کہیں مختلف زبانوں میں ترجمے ہورہے ہیں، کوئی

تسہیل کر رہا ہے، کوئی تبویب کر رہا ہے اور واقعی حضرت والا کی معمولی گفتگو میں بھی اور سر سری طور پر جو بات فرماتے تھے، اس میں بھی علوم و معارف ہوتے تھے اور آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہوتی تھی اور اکثر معمولی گفتگو بھی دین کے متعلق ہوتی تھی یا دین کا کوئی پہلو لیے ہوتی تھی۔

حضرت والا کا اپنا ارشاد:

"حضرت والا کی تصانیف کی مقبولیت عامہ کے متعلق خود حضرت والا کا اپنا ارشاد ہے۔۔۔۔۔۔ایک بار مخالفین کی مخالفانہ کارروائیوں کا ذکر فرما کر بڑے جوش کے ساتھ فرمایا:

"مخالفین سب اپنی اپنی کوششیں کرلیں، آپ دیکھیں گے کہ ان شاء اللہ میری کتابیں ایسی پھیلیں گی ایسی پھیلیں گی کہ کسی کے روکے نہ رکیں گی"۔ چنانچہ اللہ کے فضل سے ایسا ہی ہوا"۔ (اشرف السوانح:1/80، تالیفاتِ اشرفیہ)

حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کے ہر شعبے میں جو عظیم خدمات لیں ہیں، اُن کی نظیر (مثال) ماضی کی کئی صدیوں میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ مسلمانوں کی دینی ضروریات کا شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو، جس پر حضرت والا کا کوئی تفصیلی یا مختصر کام موجود نہ ہو۔ علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں ہے، جن کی تصانیف کے اوراق، اگر اُن کی زندگی کے دنوں پر تقسیم کیے جائیں تو اوراق کی تعداد، زندگی کے دنوں سے بڑھ جائے۔ امام طبریؒ، حافظ خطیب بغدادی، امام رازیؒ، امام ابنِ جوزیؒ، حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کے نام اِس سلسلے میں لیے جاسکتے ہیں اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی اس سلسلے میں داخل ہے۔ حضرت والا کا نام اِن (مذکورہ) مبارک ہستیوں کے ساتھ جو لیا گیا ہے، اس کا سبب یہ تھا کہ حضرت والا کے اوقات میں برکت ہی برکت تھی۔

حضرت والا کے اوقات میں برکت:

حضرت والا کو اللہ نے شروع ہی سے اعلیٰ درجے کا ملکۂ تصانیف عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ طالب علمی کے زمانے میں، جبکہ صرف اٹھارہ سال کی عمر تھی، فارسی کی ایک کتاب (مثنوی زیروبم) لکھی۔ حضرت والا کی تصانیف میں شروع ہی سے غیبی امداد شاملِ حال رہی ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا کو بہت کم وقت میں بہت زیادہ کام دیکھ کر یہ بشارت دی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے وقت میں برکت رکھی ہے۔ چنانچہ واقعی حضرت والا کے وقت میں واضح طور پر برکت دیکھنے میں آتی تھی۔ جتنے وقت میں جتنا کام حضرت والا کر لیتے تھے اکثر تجربہ کاروں کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

اوقات کا نظم وضبط:

"حضرت والا وقت کو ضبط کرنے کے یہاں تک پابند تھے کہ ایک مرتبہ حضرت والا کے استاذِ محترم (شیخ الہند) جناب مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بطور مہمان) تشریف لائے تو حضرت والا نے اپنے استاد کے لیے راحت اور آرام کے سارے انتظامات فرما دیے، جب تصنیف کا وقت آیا تو نہایت ادب کے ساتھ اجازت حاصل فرما کر تصنیف کے کام مشغول ہوگئے، پھر دل نہ لگا اور تھوڑی ہی دیر بعد حاضرِ خدمت ہوگئے، لیکن بالکل ناغہ اس دن بھی نہیں فرمایا"۔

(اشرف السوانح:1/88، تالیفاتِ اشرفیہ)

تصانیف کے لیے متعلقہ کتب کی دستیابی:

حضرت والا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ بعض تصانیف میں کسی بہت ہی مختصر سی بات کے لیے دوسری کتب کی ضرورت پڑتی تھی، جو بڑے اہتمام اور خرچ کے ذریعے منگوائی جاتی تھیں، اُن کی مدد سے ایک ذرا سی عبارت لکھ کر اُن کو فوراً واپس کر دیا جاتا۔ اب ذرا سی عبارت پڑھنے والا تو یوں ہی پڑھتا چلا جائے گا، اُسے کیا خبر کہ اس کے لکھنے میں کتنا اہتمام کیا گیا ہے۔

یادداشت کو ضبط کرنے کا طریقہ:

حضرت والا جس زمانے میں کثرت کے ساتھ تصنیف فرماتے تھے، اُس زمانے میں اکثر اپنے پاس قلم اور کاغذ رکھا کرتے تھے اور جس وقت کوئی مضمون ذہن میں آتا اُسے فوراً لکھ لیتے، بعض اوقات رات کو سوتے وقت بھی تکیہ کے نیچے کاغذ، قلم رکھتے تھے، تاکہ اگر رات کو بھی کوئی مضمون ذہن میں آئے تو روشنی کر کے اُس کے متعلق یادداشت لکھ لی جائے۔

چنانچہ جب بہشتی زیور کا حصہ دہم تالیف فرمارہے تھے، جس میں عورتوں کی بدتمیزیوں کا بھی ذکر ہے، اُس وقت جب بھی کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو جہاں بدتمیزی کی بات دیکھنے میں آتی، اُسے لکھ لیتے۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ حضرت والا اپنے دماغ پر کسی بات کو یاد رکھنے کا بوجھ، بغیر کسی ضرورت کے نہیں ڈالتے تھے۔ چنانچہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جس وقت، جو کام پیش آتا ہے، اُسے فوراً کر ڈالتا ہوں، دوسرے وقت پر نہیں ٹالتا، اگرچہ اس میں تھوڑی تکلیف ہوتی ہے، لیکن فراغت کے بعد بالکل بے فکری ہو جاتی ہے اور پھر راحت ہی راحت رہتی ہے۔

(اشرف السوانح: 1/ 87، 88، تالیفاتِ اشرفیہ)

حضرت والا کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے، اشرف السوانح، حضرت والا کی زندگی میں لکھ لی گئی تھی، جس میں رسائل و مواعظ کی فہرست بھی نقل کی گئی ہے، حضرت والا اُس وقت (جب اشرف السوانح لکھی گئی تھی) چھ سو چھیاسٹھ (666) کتابیں تصنیف فرما چکے تھے، اُس کے بعد حضرت والا نے اور بھی تصانیف لکھیں اور حضرت والا کے محبین و مجازین نے حضرت والا کی کتب سے تالیفات کی ہیں، مجموعی طور پر حضرت والا ایک ہزار سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں اور بعض جگہ آٹھ سو (800)، ایک ہزار (1000)، سولہ سو (1600)، دو ہزار (2000) کتابوں کا ذکر بھی آتا ہے۔

اور تعداد میں اختلاف اس لیے ہے کہ بعض نے تالیفات کو جمع نہیں کیا، اس لیے اُن کے نزدیک مجموعہ کم ہے، جنہوں نے جمع کیا ہے، اُن کے نزدیک مجموعہ بھی زیادہ ہے۔ حضرت والا کے ملفوظات الحمدللہ تیس جلدوں میں ہیں اور خطبات بتیس جلدوں میں ہیں۔ اگر حضرت والا کی تصانیف کو مطالعہ میں لایا جائے، تو یقیناً تجربہ ہوگا کہ اس میں علوم و معارف کے جواہرات کے انبار (ڈھیر) کے انبار ہیں، گویا حضرت والا کے ملفوظ اس قدر جامع ہیں کہ لفظ لفظ میں ایک کتاب چھپی محسوس ہوتی ہے۔

یوں تو حضرت والا کی تمام تصانیف بے حد نافع اور ضروری ہیں، لیکن یہاں چند کتابوں کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا جارہا ہے، جو خاص امتیازی شان رکھتی ہیں، مثلاً تفسیر بیان القرآن، حیوٰۃ المسلمین، بہشتی زیور، اعلاء السنن جو حضرت کے حکم پر، حضرت کے بھانجے (مولانا ظفر احمد عثمانی تھانویؒ) نے لکھی تھی۔

تفسیر بیان القرآن:

حکیم الامت، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور و معروف تفسیر، بیان القرآن کے متعلق کچھ تحریر کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، یہ کس علمی درجے کا کام ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ بیان القرآن کے بعد جتنے بھی مفسّرین نے تفاسیر لکھی ہیں، وہ بیان القرآن سے استفادہ کرنے سے اپنے آپ کو مستغنیٰ نہیں رکھ پائے، نیز اِس (بیان القرآن) کے متعلق حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگردوں کو ایک مرتبہ بخاری کا درس دیتے وقت فرمایا تھا: "میں تو ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ اردو کا دامن، علم و تحقیق سے خالی ہے، لیکن مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اپنی رائے میں ترمیم (تبدیلی) کرنا پڑی اور اب میں سمجھتا ہوں کہ اردو بھی بلند پایہ علمی تحقیقات سے بہرہ ور ہے۔ (یعنی اردو میں بھی علمی و تحقیقی کام موجود ہے)۔" (مقدمہ تفسیر بیان القرآن: 1/ 3، رحمانیہ)

گزرتے زمانے کے ساتھ ساتھ بیان القرآن میں الفاظ ثقیل معلوم ہونے لگے تھے، اس لیے اب بیان القرآن کی تسہیل بھی ملتی ہے، اس لیے اُس میں قوسین (بریکٹ) کے درمیان، آسان الفاظ میں وضاحت بھی تحریر کر دی گئی ہے، جو اب عام وخاص سب کے لیے مفید ترین تفسیر ہے۔

آسان بیان القرآن:

نیز اب حال ہی میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری کے ٹاؤن کے استاد اور حضرت مولانا محمد انور بدخشانی (استاذ الحدیث بنوری ٹاؤن کراچی) کے صاحبزادے جناب مولانا محمد عمر انور بدخشانی نے بیان القرآن کی تسہیل کی ہے جو "آسان بیان القرآن" کے نام سے معروف ہے۔ اس میں دیگر معاصر تفاسیر سے استفادہ کر کے بیان القرآن کی تسہیل کرنے کی بہت ہی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔ اس میں گویا ترجمہ شیخ الہند کا ہے، خلاصہ تفسیر حضرت حکیم الامت کا اور تفسیری فوائد تفسیر عثمانی سے لیے گئے۔ گویا نہ صرف بیان القرآن کی تسہیل ہوئی بلکہ بیان القرآن اور تفسیر عثمانی یکجا ہو گئیں ہیں۔ مزید تفصیل آسان بیان القرآن کے مقدمے میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

حیوٰۃ المسلمین:

حیوٰۃ المسلمین کو حضرت والا نے واضح اور جامع مانع عبارت میں تحریر فرمایا ہے، جتنی مشقت حضرت والا نے اِس (حیوٰۃ المسلمین) کی تصنیف میں کی، اتنی کسی اور تصنیف میں نہیں کی۔ خود فرماتے تھے کہ حیوٰۃ المسلمین کی تصنیف میں مجھے جو تعب (تھکان) اٹھانا پڑا ہے، اپنی کسی اور تصنیف میں نہیں اٹھانا پڑا، کیونکہ اس کے اکثر مضامین کے دو مسوّدے اور کسی مضمون کے تین مسوّدے تک لکھنے پڑے۔ حضرت والا کی اس تصنیف کی اہمیت کیا ہے، وہ آپ اِس ارشاد سے اندازہ لگا سکتے ہیں، جو حضرت والا نے فرمایا:

"گو (اگرچہ) لوگوں نے اِس (حیوٰۃ المسلمین) کو اس نظر سے نہیں دیکھا، لیکن یہ مسلمانوں کی مادی اور روحانی فلاح کے لیے اتنی نفع بخش کتاب ہے کہ مجھے اس کے اجر میں ان شاء اللہ تعالیٰ مغفرت کی توقع ہے۔"

کیونکہ حضرت والا کو دنیوی مفاد سے بالکل کوئی غرض نہیں تھی، حتیٰ کہ حضرت والا کی طرف سے عام اجازت تھی کہ جس تصنیف کو جو چاہے اور جتنی تعداد میں چاہے چھپوا سکتا ہے۔ یہ حضرت والا کا خاص وصف ہے، اُنہیں دنیا سے کوئی مطلب نہیں تھا، وہ فقط یہی چاہتے تھے کہ دین کی تعلیم لوگوں تک زیادہ سے زیادہ پہنچے۔ (اشرف السوانح: 1/90، تالیفاتِ اشرفیہ)

بہشتی زیور:

حضرت والا کی مشہور کتاب "بہشتی زیور" کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، جس میں ایک مسلمان کی پیدائش سے لے کر مرنے تک کے تمام ضروری مسائل، جو اُسے پیش آتے ہیں، درج کیے ہوئے ہیں۔ بہشتی زیور خواص وعوام میں مقبول ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک "بہشتی زیور" تقریباً ہر گھر میں موجود تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، زبان میں تبدیلی واقع ہوتی گئی، اردو میں فارسی کی آمیزش (ملاوٹ) تقریباً ختم ہونے لگی، تو اسی کتاب کو اس انداز سے ترتیب دیا جانے لگا کہ عام آدمی کے لیے بھی مشکل نہ ہو۔

جو شخص بہشتی زیور کے مسائل سمجھ لے اور یاد کر لے تو بقیہ فقہ کی کتابیں، مثلاً قدوری، کنز الدقائق، شرح الوقایہ اور ہدایہ آسان ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کتاب، مدارس میں درساً (سبق کے طور پر) پڑھائی بھی جاتی ہے۔ حضرت والا کی حیات میں لاکھوں کی تعداد میں بہشتی زیور کے نسخے چھپ چکے تھے اور پڑھائے جاتے تھے اور اس کی تمنا حضرت والا نے اس کے دیباچے میں تحریر فرمائی تھی:

"دل اس وقت بہت مسرور (خوش) ہو گا کہ جو مضامین ذہن میں ہیں، وہ سب جمع ہو جائیں اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ لڑکیوں کے درس میں عام طور پر یہ کتاب داخل ہو گئی ہے اور گھر گھر اس کا چرچا ہے۔ آئندہ توفیق حق جل شانہ کے قبضہ قدرت میں ہے"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (بہشتی زیور: 15، مکتبہ البشریٰ)

"اعلاء السنن" کی تالیف:

حضرت والا نے تصوف، تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، تجوید، سبھی دین کے شعبوں کے متعلق کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، البتہ اُن میں سے حدیث کی زیادہ تر خدمت کسی کے واسطے سے فرمائی ہے، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت والا نے چاہا کہ فقہ حنفی کے کل ابواب کے دلائل احادیث سے جمع کیے جائیں اور اس کے متعلق بطور نمونہ ایک رسالہ (جامع الآثار مع حاشیۃ تابع الآثار) بھی لکھا۔ کچھ دن بعد حضرت والا کو دوسرے کام کرنے والے مل گئے، اس لیے اپنی نگرانی میں "اعلاء السنن" جس کے پہلے حصے کا نام "احیاء السنن" ہے لکھوانا شروع فرما دیا اور خود اصلاح فرماتے رہے اور اس طرح بہت سی کتابیں حضرت والا نے اپنی نگرانی میں لکھوائی، جن کی تعداد اگر لکھنا شروع کریں تو یہ مستقل موضوع ہونے کی جہ سے مقالہ طویل ترین ہو جائے گا۔ اعلاء السنن کی تالیف کو حضرت والا اتنا ضروری سمجھتے تھے کہ اس کی تالیف پر ہزاروں روپے خرچ کر دیے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر یہی ایک کتاب تیار ہو جائے، تو یہ بڑا کارنامہ ہو گا، کیونکہ یہ اپنی شان کی ایک بالکل نئی تصنیف ہے۔

(اشرف السوانح:1/78، تالیفاتِ اشرفیہ)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارنامے

تاریخِ اسلام کے ایک ہزار سال اِس شان و شوکت اور عروج کے ساتھ گزرے کہ اپنوں سے زیادہ غیروں نے اعتراف کیا کہ مسلمانوں نے ایسے کارنامے سر انجام دیے ہیں، جو عقلوں کو حیران کر دیتے ہیں، لیکن اس دوران بھی فتنے ضرور پیدا ہوئے تھے اور مسلمانوں کے اقتدار کی وجہ سے اُن کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا، فتنے آتے اور بادل کی طرح چھٹ جاتے، لیکن تقریباً گیارھویں صدی ہجری، مسلمانوں کے مسلسل زوال اور اقوامِ یورپ کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس وقت سے مسلمانوں پر فتنوں کا طوفان اور زندگی کے تمام شعبے، علمی و عملی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی حالات میں زوال تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ اگر اُس زمانے کے ساتھ موازنہ کریں، تو یہ محسوس ہو گا کہ وہ کوئی اور قوم تھی اور یہ دوسری قوم ہے۔

اسی طرح صالحین اور مصلحین سے، اس امت کا کوئی بھی دور الحمد للہ خالی نہیں رہا (ان شاءاللہ آئندہ بھی خالی نہیں رہے گا) مگر تھوڑے زیادہ اور درجے اور مرتبے کا فرق ضرور ہوتا رہا ہے، اس جماعت میں قلت بھی آئی اور ضعف بھی، لیکن ہر زمانے میں یہ جماعت مسلمانوں کے امراض کی تشخیص اور علاج و اصلاح کرنے میں اپنا فرض ادا کرتی رہی ہے۔

ہمارے اِس آخری دور میں بقیۃ السلف، حکیم الامت، مجدد الملت، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے حقیقی معنیٰ میں حکیم الامت بنایا تھا اور اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے، جو خود بھی بزرگ ہو، عارف اور ولی اللہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے گزشتہ صدی میں حضرت والا کو تجدیدِ دین اور اصلاحِ امتِ محمدیہ کی خدمت کے لیے پیدا فرمایا تھا، مسلمانوں کی اصلاح اور فلاح کی فکر، حضرت والا کی طبیعت میں داخل تھی، حضرت والا چونکہ منجانب اللہ مقامِ مجددیت پر فائز تھے، اس لیے آپ کی تقریر، تحریر، تالیف، تدریس و تبلیغ اور مواعظ و ملفوظات میں جو برکت رکھی گئی ہے وہ کسی صاحب بصیرت سے مخفی نہیں۔ آج تقریباً پون صدی سے زائد کا عرصہ گزر گیا، آپ کی تقریر و تحریر کا فیض ہر سمت پھیل رہا ہے اور پھیلتا رہے گا اور چھوٹا بڑا کوئی بھی آپ کی تعلیمات سے مستغنی نہیں ہے۔

اصلاح بذریعہ خط و کتابت:

حضرت والا کے تجدیدی کارناموں میں سے ایک یہ ہے کہ آپؒ نے طالبینِ حق کی اصلاح کے لیے خط و کتابت کا سلسلہ جاری فرمایا کہ جو شخص جس شعبۂ زندگی میں ہے، دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی ہے، وہیں رہتے ہوئے بذریعہ خط اپنے دینی سوالات، روحانی امراض وغیرہ کے

بارے میں لکھتا اور حضرت والا کو جو جواب منجانب اللہ القاء ہوتا، تحریر فرمادیتے۔ ان خطوط کا انداز یہ ہوتا تھا کہ سائل نصف صفحہ پر سوال لکھتا اور بقیہ نصف صفحہ خالی چھوڑ دیتا، اس طرح سوال وجواب دونوں محفوظ رہتے اور حضرت والا ان کی ایک نقل اپنے پاس محفوظ فرمالیتے۔

اس مجددانہ کارنامے کو مختصر الفاظ میں "اصلاح بذریعہ خط" کا نام دیا جاسکتا ہے، جس سے اکابر خلفاء اور علماء نے ہی استفادہ نہیں کیا، بلکہ گردونواح کے ہزاروں حضرات نے آپ سے خط وکتابت کی اور اپنی جگہ رہتے ہوئے علوم اشرفیہ سے فیض یاب ہوئے۔ یہ آپ کے کمالِ اخلاص کی علامت ہے۔ آج مصروف زندگی میں دور دراز سے سفر کرکے آنا جانا اور شیخ کی خدمت میں رہ کر اپنا تزکیہ کرانا، کس قدر مشکل امر تھا۔ ایسے حالات میں خط وکتابت کے ذریعے اپنی اصلاح کرالینا کس قدر عظیم نعمت ہے، یہ ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

حضرت والا کے الہامی جوابات، روحانی امراض کے لیے کس قدر اہم تھے، اُن کی قدرومنزلت کیا تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے جو عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خلیفہ (حضرت شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ) سے فرمائی: سائل کا سوال غور سے پڑھا جائے، پھر حکیم الامتؒ کا تحریر کیا ہوا جواب پڑھنے سے پہلے، خود سوچا جائے کہ اس کا جواب کیا ہوسکتا ہے، دو تین مرتبہ سوچا جائے، پھر حضرت والا کا لکھا ہوا جواب پڑھا جائے، تو حضرت والا کے مقام ومرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس طریقۂ اصلاح کے حضرت والا مجدد ہیں، اس سے پہلے اس کی شکل معدوم تھی۔ حضرت والا نے اس کو جاری فرماکر لوگوں تک دین کی تعلیم کا پہنچنا آسان کردیا تھا۔

تصوف:

حضرت والا کے تجدیدی کارناموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت والا نے تصوف کو اصلی شکل وصورت میں پیش کیا، اس سے پہلے لوگوں نے تصوف (دین کے اہم شعبہ) کو بگاڑ رکھا تھا۔ پیر حضرات چاہتے تھے کہ ہمارے خادمین کی تعداد بڑھ جائے، جس کے لیے وہ خود ترغیب دیتے تھے کہ بیعت ہوجاؤ اور اس کا مقصد لوگوں کا ہجوم بڑھانا ہوتا تھا، تاکہ ہمارا نام ہو کہ بڑے بڑے لوگ ہمارے پاس آتے ہیں۔ نہ پیر کی نیت درست ہوتی تھی، نہ مریدوں کی، بعض پیر تو ہر شخص کو مرید کرلیتے تھے، وہ نہ طلب کی تحقیق کرتے تھے، نہ ہی نیت کی تحقیق کرتے تھے، بس سمجھتے تھے کہ ایک خادم بڑھ رہا ہے تو آنے دو۔ پھر اُس کے کاموں پر کوئی روک ٹوک بھی نہیں کرتے تھے کہ کہیں بددل نہ ہوجائے اور ہم سے الگ نہ ہوجائے اور ہماری آمدنی کم نہ ہوجائے۔

دوسری خرابی یہ بھی موجود تھی کہ لوگ بیعت کو اس قدر ضروری سمجھتے تھے کہ اگر اُن سے پوچھا جاتا کہ تعلیم کے بغیر بیعت ہونا چاہتے ہو یا تعلیم چاہتے ہو بیعت کے بغیر، تو یہی کہا جاتا کہ بیعت ہونا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ رسمی پیروں کے ہاں بھی یہی برائی تھی کہ وہ بیعت کیے بغیر تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اگر بیعت نہ کی تو پتا نہیں یہ ہمارے پاس آنا ہی چھوڑ دے گا، اب چلو بیعت کی وجہ سے پھنس تو گیا ہے، ہمارے پاس آیا تو کرے گا۔

حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ نفسِ بیعت میں کوئی اثر نہیں اور بیعت کی یہ صورت بھی ضروری نہیں ہے، اصل چیز بیعت کی روح یعنی اتباع ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بیعت ہوجائیں گے تو ٹھیک ہوجائیں گے، پیر کی توجہ سے سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ حضرت والا اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ، ابوطالب کی طرف توجہ فرماتے تھے یا نہیں؟ حضور ﷺ، اُن کے مرنے کے وقت تک کوشش میں رہے، یہاں تک کہ فرمایا کہ میرے کان میں ہی کلمہ پڑھ لو، لیکن انہوں نے نہیں پڑھا، حالانکہ آپ ﷺ کی توجہ سب سے زیادہ تھی، تو پھر اثر کیوں نہیں ہوا؟ معلوم ہوا کہ پیر کی توجہ سے سب کچھ نہیں ہوتا اور مرید ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے، بس پیر کے کہنے کے مطابق کام کرنا شروع کردو، بس ہوگیا تعلق۔ واللہ وہی نفع ہوگا جو پیری مریدی میں ہوتا ہے۔ (حضرت تھانویؒ کا طریقہ اصلاح:149، بیت العلوم)

حضرت والا نے مختلف انداز سے اپنے مواعظ اور خطبات اور مکتوبات میں بیعت کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہوئے اس کا صحیح مقام و مرتبہ ذہن نشین کرایا ہے اور اس کے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں کے ذہنوں میں تھیں، اُن کو دور کرنے کے لیے حضرت والا فرماتے ہیں: ”نہ اس میں کشف اور کرامات ضروری ہیں۔نہ قیامت کے دن بخشوانے کی ذمہ داری ہے۔نہ کوئی وعدہ ہے کہ تعویذ گنڈوں سے کام بن جائے گا، یا مقدمات، دعا سے فتح ہو جایا کریں گے، یا روزگار میں ترقی ہو گی، یا جھاڑ پھونک سے بیماری جاتی رہے گی۔نہ تصرفات لازم ہیں کہ پیر کی توجہ سے مرید کی خود بخود اصلاح ہو جائے گی۔ اُسے گناہ کا خیال بھی نہیں آئے گا۔خود بخود عبادت کے کام ہوتے رہیں گے۔نہ ذکر وغیرہ میں انوارات کا نظر آنا ضروری ہے۔ایسا کچھ بھی ہونا ضروری نہیں ہے۔بلکہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا ہے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ، شریعت کے حکموں پر پورے طور سے چلنا ہے“۔ (تربیت السالک:1/39،زمزم پبلشرز)

غرض اس قسم کے غلط خیالات پیدا ہو چکے تھے، تو حضرت والا نے اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور لوگوں کو جہالت سے نکالنے کا عزم کیا، اسی لیے حضرت والا آسانی سے بیعت نہیں فرمایا کرتے تھے۔ حضرت والا کے سامنے یہ بھی تھا کہ پیر حضرات، مریدین سے نرمی برتتے تھے، روکتے ٹوکتے نہیں تھے جس کی وجہ سے مسلمان کا ضرر ہوتا تھا، اس لیے حضرت والا کے ہاں ایک لحاظ سے سختی بھی تھی۔

حضرت والا بڑی عظیم سوچ کے مالک تھے وہ اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ یہ سختی کس قدر ضروری ہے اور صحیح بھی یہی ہے کہ سو مریدوں کے بجائے دس ہوں، مگر کام کے ہوں۔ جو سختی کو برداشت کرتا وہ ٹھہر جاتا اور جو جانا چاہتا، اسے روکتے نہیں تھے، کیونکہ خریدار کو تو وہ پھنسائے گا جس کا سودا اچھا نہیں ہو گا اور جس کا سودا بے مثال ہو گا، وہاں سے گاہک پلٹ کر واپس ہی نہیں جائے گا۔ حضرت والا کے ہاں سودا کھرا ہوتا تھا، اس لیے کوئی لوٹتا نہیں تھا۔

اصلاحِ معاشرت:

جتنے بھی مجددین گزرے ہیں وہ اپنی تمام تر کوشش اِس کام میں صرف کرتے ہیں کہ جو باتیں دینِ اسلام نے بتائی ہیں، اُن کو افراط و تفریط سے محفوظ رکھا جاسکے۔اُن مجددین کا کام، مسلمانوں کی حکومت ہو یا غیر مسلموں کی حکومت ہو، جاری رہتا ہے۔البتہ اسلامی حکومت میں مجدد کا کام آسان ہو جاتا ہے، وہ اس طرح کہ معاشرہ چونکہ مسلمانوں پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے دوسرے ذرائع کے علاوہ، ارکانِ حکومت کو بھی استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ مجددالفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے معاملے میں ہمیں نظر آتا ہے۔لیکن اگر حکومت مسلمانوں کی نہ ہو تو مجدد کے لیے یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ عوام کے اندر رہ کر اصلاحِ معاشرہ کا کام سرانجام دینے کی کوشش کرے، حضرت والا کے سلسلے میں یہی صورت ہے، اسی لیے عوام میں رہ کر حضرت والا نے معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور اپنے کام کو حضرت والا نے جس نوعیت پر پایا تھا، اسی بنیاد پر حضرت والا نے خود کو ”مجددِ معاشرت“ کہا تھا۔

حضرت والا نے لوگوں کے اخلاق اور معاشرت کی اصلاح کی طرف خصوصیت سے توجہ دی تھی اور صوفیاء کرام کی طرح لوگوں کو ذکر و شغل میں ہی مصروف نہیں رکھا۔ حضرت والا اکثر فرمایا کرتے تھے: ”میری نظر، ذکر و شغل پر اس قدر نہیں ہے جس قدر اخلاق و معاشرت پر ہے، کیونکہ ان کا تعلق دوسروں سے ہے۔“

حضرت تھانویؒ کی تقریباً ایک ہزار سے زائد کتابوں کے مطالعے سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ دین کا کوئی بھی شعبہ (جو اصلاح طلب ہے یا تجدید کا محتاج ہے) ایسا نظر نہیں آئے گا، جو حضرت والا کی جامع نظر سے نظر انداز ہوا ہو۔اِن تمام تصنیفات کا بڑا ذخیرہ، حضرت تھانویؒ کو موجودہ صدی کے علمی و عملی میدان میں اعلیٰ مقام دینے کے لیے اور مجددالملت کا ”خطاب“ دینے کے لیے کافی ہے۔ حضرت والا کی

ذخیرۂ تصانیف میں سے تقریباً اسی (80) فیصد حصہ، معاشرت کی تعلیم پر مشتمل ہے، جو معاشرت کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ تمام اصلاح طلب کاموں میں "اصلاحِ معاشرت" سرفہرست نظر آتا ہے اور اس کی وضاحت مختلف موقعوں پر حضرت والا نے خود فرمائی ہے۔ ایک موقعہ پر فرمایا: "معاشرت کو تو لوگوں نے دین کی فہرست سے ہی نکال دیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ذکر و شغل، تلاوتِ قرآن، نفل وغیرہ کے متعلق تو شریعت کے احکام ہیں، آگے جو چاہے کرتے پھریں، جس کا معنٰی آج کل آزادی کے ہیں۔ سو خوب سمجھ لو! تمہیں ہرگز ہرگز آزاد نہیں چھوڑا گیا۔۔۔۔۔۔ بلکہ شریعت نے (ہماری بول چال، اٹھنا بیٹھنا، لین دین، کھانے پینے) ہر چیز کے متعلق ہمیں آگاہ کیا ہے۔ شریعت مکمل قانون ہے۔" (حضرت تھانویؒ کا طریقۂ اصلاح:47، بیت العلوم)

حضرت والا کے نزدیک معاملات سے زیادہ معاشرت کا اہتمام ضروری ہے، کیونکہ معاملات کی اصلاح میں تو زیادہ تر لوگوں کے مال کی حفاظت ہے اور حسنِ معاشرت میں مسلمانوں کے دلوں کی حفاظت ہے اور ظاہر ہے کہ مال سے زیادہ دل کا رتبہ ہے۔ اس کے علاوہ معاشرت کی اصلاح میں لوگوں کی آبرو کی حفاظت بھی ہے اور آبرو کی حفاظت، ایمان کے بعد، ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ آبرو بچانے کے لیے، انسان ہر چیز قربان کر دیتا ہے۔ آبرو کی حفاظت اِس قدر ضروری کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس کے متعلق آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا: "تمہارے خون، تمہارے اموال، تمہاری عزتیں باہم ایک دوسرے پر قیامت تک حرام ہیں"۔ اس لیے حضرت والا نے اصلاحِ معاشرت کی طرف توجہ سب سے زیادہ فرمائی ہے۔ کیونکہ حضرت والا کے نزدیک، معاشرت صرف شریعت کا ایک جز ہی نہیں، بلکہ بعض وجوہ سے یہ نماز اور روزے سے بھی زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ کیونکہ عبادت میں کوتاہی ہو جائے تو اپنا نقصان ہوتا ہے اور امورِ معاشرت میں کوتاہی سے دوسروں کو ایذا ہوتی ہے، دوسرے کی دل آزاری ہوتی ہے۔ دوسرے کی دل آزاری نہ ہو، یہی تو "حسنِ معاشرت" ہے اور یہی تو انسانیت ہے اور حضرت والا کی تمام اصلاحات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت والا انسان بناتے تھے، کیونکہ اُن کے نزدیک صوفی یا بزرگ بننا آسان ہے اور انسان بننا مشکل ہے اور حضرت والا کے نزدیک اسی (انسانیت) کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔

حضرت والا معمولی معمولی چیزوں کی طرف توجہ زیادہ فرماتے تھے، اس لیے کہ لوگ اُن (معمولی) چیزوں کو بُرا نہیں سمجھتے تھے اور پھر اس کے عادی ہو جاتے تھے، حالانکہ یہی رویہ اگر اُن کے ساتھ ہو تو پھر بُرا معلوم ہوتا ہے اور دل شکنی ہوتی ہے، اس کی اصلاح حضرت والا نے اس قدر تفصیل اور اہتمام کے ساتھ فرمائی کہ ایسی توجہ صدیوں سے نہ ہوئی تھی۔ اُن کی مثالیں "اصلاحِ معاشرت" کے عنوان میں قلمبند کر دی گئی ہیں۔

ذیل میں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے، جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت والا نے کس انداز سے اصلاحِ معاشرت کی تعلیم دی ہے۔

"ایک معمولی بات ہے کہ کرسی کہیں سے اُٹھا کر دوسری جگہ (جہاں راستہ ہے) رکھیں گے اور وہیں چھوڑ کر چلیں جائیں گے، اب کوئی اندھا یا اپاہج آئے گا تو گرنے کا اندیشہ ہے۔ بعض لوگ چارپائی ایسی جگہ چھوڑ دیتے ہیں کہ آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس معمولی سی کوتاہی میں نہ صرف یہ کہ تعلیم یافتہ، بلکہ ایسے لوگوں کا بھی معمول ہے، جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں، لیکن تہذیب کے آداب سے ناواقف ہیں۔" (حضرت تھانویؒ کا طریقۂ اصلاح:51، بیت العلوم)

یہ سوچ تھی حضرت تھانویؒ کی اور ہر صدی کا مجدد اپنی صدی کے کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے اور حضرت والا کے کمالات، حضرت والا کی تصانیف کا مطالعہ کرنے سے بخوبی معلوم ہوتے ہیں۔

احکامِ اسلام کا دفاع

تصوف، تقلید اور پردہ:

علوم کی دو قسمیں ہیں۔ایک ظاہری علوم اور دوسری باطنی علوم اور باطنی علوم کو حاصل کیے بغیر، ظاہری علوم سے استفادہ ممکن نہیں ہے۔تصوف اور سلوک اسی ظاہری وباطنی علوم کے امتزاج کا دوسرا نام ہے ،جو اصطلاحِ شریعت میں طریقت کہلاتا ہے۔چنانچہ علمائے تصوف، ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ باطنی علوم کی بھی تعلیم دیتے ہیں، جسے اصطلاح میں "معرفۃ اللہ کی طرف بلانا" کہتے ہیں۔معرفۃ اللہ کے راستے میں دو چیزیں ہیں: ایک اچھی صفات، مثلاً تقویٰ، توکل، صبر وشکر، ناشکری، قناعت کا نہ ہونا وغیرہ ہے۔دوسری مطلوبہ چیزوں کو حاصل کرنا اور غیر مطلوبہ چیزوں سے بچنے کے لیے، نفس کو جس اصلاح وتربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور جس حیلے اور بہانے سے نفس کو سدھارنے کی ضرورت پڑتی ہے، شیخِ کامل اُن درپیش مشکلوں کا حل، ہر سالک کی استعداد کے مطابق بتاتے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ سے جُڑ جائے۔

گزشتہ صدی میں حضرت حکیم الامت، مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانویؒ، اُنہی مشائخ اور اولیاء میں سے ہیں، جن کی مثال قریب زمانے میں ملنا بہت مشکل ہے۔چنانچہ اللہ نے ارشاد وتربیت میں جو مقام آپؒ کو عطا فرمایا تھا وہ بالکل متقدمین (علماء) جیسا تھا۔بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ فنِ تصوف، جو اپنی اصل بنیادوں پر باقی نہ رہا تھا، حضرت والا نے اُسے اُس کی اصل بنیادوں پر زندہ فرمایا تھا، تو غلط نہ ہوگا۔تصوف اور سلوک میں حضرت تھانویؒ جو کچھ تصنیف فرمایا، وہ ایک بیش بہا خزانہ اور نہایت عمدہ ذخیرہ ہے۔اُن میں سے ایک کتاب "تربیت السالک" کے نام سے بھی ہے ،جو منفرد حیثیت رکھتی ہے، جس کا مطالعہ ہر سالک کے لیے ضروری ہے۔اس لیے کہ اس کتاب کو اگر تصوف کا مخزنِ معلومات (انسائیکلوپیڈیا) کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

لیکن صرف کتابوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس کے لیے کسی شیخ کی صحبت اختیار کرنا ضروری ہے۔

شیخِ کامل کی علامت:

حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں کتابوں کو بے کار نہیں کہتا، وہ بے شک کام کی ہیں، مگر طبیب کے کام کی ہیں، مریض کے کام کی نہیں ہیں۔صرف کتابیں دیکھ کر ہی اپنی اصلاح نہیں ہوسکتی، حالانکہ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے، لیکن تم اس سے استفادہ نہیں کرسکتے، اس لیے کسی شیخِ کامل کی صحبت میں رہنا ضروری ہے اور شیخِ کامل کی علامات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(1) ضرورت کے مطابق دین کا علم رکھتا ہو، (2) عقائد، اعمال واخلاق میں شریعت کا پابند ہو۔(3) نہ دنیا کی حرص رکھتا ہو اور نہ ہی کمال (کے پائے جانے) کا دعویٰ کرتا ہو، کیونکہ یہ بھی دنیا کا حصہ ہے۔(4) کسی شیخِ کامل کی صحبت میں کچھ دن رہا ہو۔(5) زمانے کے منصف علماء ومشائخ، اُسے اچھا سمجھتے ہوں۔(6) عوام کی نسبت، خواص یعنی سمجھدار اور دیندار لوگ اس کی طرف مائل ہوں۔(7) جو لوگ اس سے بیعت ہوں، اُن میں اکثر کی حالت، شریعت کی پیروی کرنے اور دنیا کی حرص کم رکھنے کے لحاظ سے اچھی ہو۔(8) وہ شیخ تعلیم وتلقین کرنے میں اپنے مریدوں پر شفقت کرتا ہو، اُن کی کوئی بری بات سنے یا دیکھے، تو انہیں روک ٹوک کرتا ہو، نہ یہ کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔(9) اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں ترقی ہوتی ہو۔(10) خود بھی ذکر وشغل کرتا ہو، کیونکہ بغیر عمل، یا عزمِ عمل کے، تعلیم میں برکت نہیں ہوتی ہے۔ (تسہیل تربیت السالک: 1/44، زمزم پبلشرز)

جس شخص میں یہ علامات ہوں، اس میں کوئی اور بات نہیں دیکھنی چاہیے، کہ اس سے کرامت ظاہر ہوتی ہے یا نہیں، کشف ہوتا ہے یا نہیں، دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں وغیرہ۔کیونکہ یہ سب چیزیں، شیخ ہونے کے لیے یا ولی ہونے کے لیے لازمی نہیں ہیں۔لیکن افسوس کہ بزرگوں

کے اس طریقۂ اصلاح پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس طریقے سے معتقدین (ماننے والے) کم ہو جائیں گے، اس لیے اس طریقے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت والا نے اس کا دفاع کرتے ہوئے جواب دیا ہے کہ "اول تو یہ خیال ہی غلط ہے کہ آدمی کم ہو جائیں گے، بلکہ اس کی وجہ سے دل میں اعتقاد رکھنے والے ہوں گے، خواہ ظاہری طور پر تعداد کم ہو، اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ معتقد کم ہو جائیں گے تو کیا فوج بھرتی کر کے کہیں کام پر بھیجو گے؟ اگر زیادہ معتقد ہوئے اور کام کے نہ ہوئے تو اُن کو لے کر کیا کرو گے؟ اس سے تو اچھا ہے کہ تھوڑے ہوں، مگر کام کے ہوں، اس میں زیادہ راحت ہے کہ ہجوم نہ ہو، کیونکہ ہجوم سے اوقات میں خلل پڑتا ہے۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ میرا مزاج یہ ہے کہ مجھے تو لوگوں کے اعتقاد ہی سے وحشت ہوتی ہے، مگر جسے ہجوم سے محبت ہو، جو ہر وقت اپنے گرد مجمع چاہتا ہو، وہ تو بے شک معتقدین کی قلت سے گھبرائے گا اور وہ اس طریقۂ اصلاح کو اختیار نہیں کرے گا"۔ (اشرف الجواب: 271، مکتبہ عمر فاروق)

اسی لیے حضرت والا بیعت میں جلدی نہیں کرتے تھے، بلکہ بہت سی شرائط کے بعد بیعت کرتے تھے، کیونکہ جلدی بیعت کر لینے کی صورت میں وہ سمجھے گا کہ اس میں کوئی عمل وغیرہ کرنے کی خاص ضرورت نہیں ہے اور جب اُسے شرطیں بتلائی جائیں گی، یہ خاص طریقہ بتلایا جائے گا تو شروع ہی سے عمل کی ضرورت اسے ذہن نشین ہو جائے گی، پھر اگر وہ روک ٹوک برداشت کرتا رہا تو ان شاءاللہ بہت جلد اصلاح پا جائے گا۔ اس لیے یہ اعتراض درست نہیں ہے کہ یہ طریقۂ اصلاح غلط ہے، کیونکہ اس کے بغیر تو فضول بھرتی کرنا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت والا نے تصوف کو اصلی صورت میں پیش کیا ہے اور اس کا بھرپور دفاع کیا ہے۔

تقلید:

حضرت حکیم الامتؒ نے ان تمام شبہات واعتراضات پر گہری نظر رکھی، جو اسلام کے مخالفین کی طرف سے پیدا ہوتے رہے اور پھر ان تمام کے معقول و مدلل جوابات دیے اور اپنے مواعظ میں بیان بھی فرمائے، جس کی برکت سے سارے الزامات وشبہات ختم ہو گئے اور مسلمانوں کا ذہن، اسلامی تعلیمات کے سلسلے میں مطمئن اور پُرسکون ہو گیا۔

اسی طرح حضرت والا تقلید کا دفاع کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بعض اہلِ تعصب، ائمہ کی تقلید میں ایسا جمود اختیار کرتے ہیں کہ وہ ائمہ کے قول کے سامنے، احادیثِ صحیحہ (جو معارض بھی نہیں ہیں) کو بے دھڑک رد کر دیتے ہیں اور بہت سے لوگ، علماء کی اتباع کرنے سے عار محسوس کرتے ہیں اور بعض لوگ، بخاری و مشکوٰۃ کا ترجمہ پڑھ کر اجتہاد کا دعویٰ کرتے ہیں اور تقلید کا انکار کرتے ہیں اور اجتہاد کی حالت یہ ہے کہ ایک عامل بالحدیث (تقلید کا منکر) تنہا نماز پڑھتا تو سکون سے پڑھتا اور جب امامت کرواتا تو خوب ہل ہل کر نماز پڑھاتا، کسی نے پوچھا کہ آپ امامت کے وقت اس قدر کیوں ہلتے ہو تو کہنے لگے کہ حدیث میں اس کا حکم آیا ہے اور مشکوٰۃ کا ترجمہ نکال کر لے آیا، جس میں "مَنْ اَمَّ مِنْكُمْ فَلْيُخَفِّفْ" کا ترجمہ لکھا تھا، کہ جو شخص امام بنے، وہ ہلکی نماز پڑھے۔ مجتہد صاحب نے ہلکی کو ہِل کے پڑھنے سے تعبیر کیا اور نماز میں ہلنے لگا۔ حضرت والا فرماتے ہیں: صاحبو! میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ آج کل اجتہاد کا دعویٰ وہ کرتے ہیں، جنہیں علم سے کوئی واسطہ نہیں ہے، ورنہ صاحبِ علم کبھی اجتہاد کا دعویٰ نہیں کر سکتا، کیونکہ جب کمالِ علم حاصل ہوتا ہے، اس وقت تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم جاہل ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے تقلید کے ثبوت کے لیے ایک غیر مقلد کو مثال دے کر سمجھایا، کہ ایک صاحب نے پوچھا کہ اجتہاد کسے کہتے ہیں، تو حضرت والا نے فرمایا کہ آپ بتاؤ: اگر دو شخص سفر میں ہوں اور فجر کی نماز کے لیے پانی نہ ہو اور ایک تیمم کرتا ہے، وضو کی جگہ اور دوسرا تیمم کرتا ہے، غسل کی جگہ (رات کو احتلام ہو جانے کی وجہ سے) تو ان دونوں میں سے امام کون بنے گا، امامت کس کی افضل ہے؟ اس نے جواب دیا کہ جس نے وضو کا تیمم کیا ہے، دلیل یہ کہ طہارت تو دونوں کو برابر حاصل ہے، لیکن ایک کا حدثِ اصغر ہے اور ایک کا حدثِ اکبر، اس لیے وضو کا تیمم

کرنے والے کی طہارت قوی ہے اور اس کی امامت افضل ہے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ یہ تمہارا اجتہاد ہے۔ اب سنو! کہ تقلید کیوں ضروری ہے؟ فقہاء نے غسل کے تیمم کرنے والے کو امامت کے لیے افضل فرمایا ہے، وہ صاحب بڑے حیران ہوئے، وجہ پوچھنے لگے کہ فقہاء نے یہ بات کہاں سے نقل کی ہے۔ حضرت والا نے جواب دیا: کہ فقہاء فرماتے ہیں کہ جب پانی موجود نہ ہو تو تیمم، طہارتِ کاملہ ہے، حدثِ اصغر کے لیے اور حدثِ اکبر کے لیے بھی۔ جب تیمم طہارتِ کاملہ ہے تو جس نے غسل کا تیمم کیا ہے، وہ افضل ہے، کیونکہ اکمل (غسل) کا نائب بھی اکمل (تیمم) ہے، اس لیے غسل والے کا تیمم اکمل ہے اور اس کی امامت افضل ہے۔ یہ دلیل سن کر اُن صاحب کی آنکھیں کُھل گئیں اور کہنے لگا: واقعی اجتہاد کرنا انہی حضرات کا کام تھا۔ اسی طرح کا سوال ایک مرتبہ عطاء بن ابی رباحؒ سے پوچھا گیا کہ اگر عورتیں جماعت سے نماز پڑھیں، تو امامت کے لیے اُن میں سے کون افضل ہے؟ فرمایا کہ جو حاملہ ہو وہ افضل ہے۔ ''لِكَوْنِ طُهْرِهَا اَكْمَلُ مِنْ طُهْرِ غَيْرِ الْحَامِلِ لِبَرَاءَتِهَا مِنَ الْحَيْضِ مَادَامَتْ حَامِلاً'' (اس لیے کہ حاملہ کی طہارت، غیر حاملہ کی طہارت سے اکمل ہے، کیونکہ جب تک وہ حاملہ ہے، وہ حیض سے بری ہے) یہ جواب غیر مجتہد کبھی نہیں دے سکتا۔ (خطباتِ حکیم الامت: 13/290، تالیفاتِ اشرفیہ)

حضرت والا فرماتے ہیں کہ صاحبو! تم جب چاہو امتحان لے لو، کہ حدیث سے تم بیس احکام مستنبط کرو اور استنباط کی وجہ بھی سامنے رکھو، پھر اُن احکام کے متعلق، فقہاء کا کلام اور ان کا استدلال معلوم کرو، تو واللہ! خود قسم کھا کر کہو گے کہ فقہاء، حدیث اور قرآن کو خوب سمجھتے ہیں۔

حضرت والا نے اس (تقلید) کا دفاع بڑے احسن انداز سے کیا، جسے مخالفین نے بھی تسلیم کیا اور سب کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کا راستہ، علماء اور ائمہ کی اتباع کے بغیر مل ہی نہیں سکتا۔ عوام اگر خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے طریقہ یہی ہے کہ علماء سے احکام پوچھ کر، اُن کی اتباع کریں اور تقلید کریں اور تقلید کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ (خطباتِ حکیم الامت: 13/292، تالیفاتِ اشرفیہ)

پردہ:

اسی طرح حضرت والا نے مروّجہ پردے کا اعتراض بھی حل کر دیا اور حضرت والا نے پردے کے ثبوت کے متعلق، عقلی دلائل کے ساتھ ساتھ نقلی دلائل بھی پیش کیے ہیں اور آئے روز، پردہ کے حوالے سے جو اعتراضات، کم فہم لوگوں کی طرف سے آتے رہتے ہیں، حضرت والا نے ہر اعتراض کا تسلی بخش جواب دیا اور حضرت والا کی تعلیم میں پردے کے ثبوت کے متعلق جو طرز اختیار کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے ہر زمانے میں پردے کی مخالفت کرنے والوں کی طرف سے جو اعتراضات پیش آئے، حضرت والا کے طرزِ تعلیم کے بدولت ان کا حل مل جاتا ہے۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں، لڑکوں کو تو زینت بتلایا ہے، لیکن لڑکیوں کو زینت نہیں بتلایا یعنی دنیا کی زینت نہیں بتلایا۔ ''اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' (مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں) (الکھف: 46)

اس کی دو وجہیں ہیں، جو حضرت والا بیان فرماتے ہیں، کہ لڑکوں کے متعلق تو اللہ نے زینت فرمایا ہے اور لڑکیوں کے متعلق نہیں فرمایا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ لڑکیوں کو تم نے خود بے حقیقت سمجھا ہوا ہے، کیونکہ لڑکوں کی پیدائش سے، تمہیں خوشی زیادہ ہوتی ہے اور لڑکیوں کو عموماً وبال سمجھا جاتا ہے، تو وہ کس لیے تمہارے لیے زینت ہوں گی؟ اور لڑکیوں کو زینت کیوں نہیں قرار دیا، اس کے متعلق دوسرا نکتہ یہ ہے کہ لڑکیاں دنیا کی زینت ہیں ہی نہیں، کیونکہ عرفاً دنیا کی زینت وہ چیز ہوتی ہے، جو منظرِ عام پر زینت بخش ہو اور لڑکیاں ایسی زینت نہیں کہ تم اُنہیں

اپنے ساتھ لیے پھرو اور سب دیکھ کر کہیں کہ یہ کیسے آراستہ ہیں، بلکہ لڑکیاں تو صرف گھروں کی زینت ہوا کرتی ہیں اور یہ پردے کی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔

اور پردے کی تائید، دوسری لغت یعنی اردو سے بھی ہوتی ہے کہ عورتوں کو پردہ کرایا جائے، کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے ہیں، اور لغت کے اعتبار سے عورت کا معنٰی ہے چھپانے کی چیز۔ اب اگر عورتوں کو پردہ نہ کرایا جائے تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ، پہننے کی چیز کو نہ پہنو اور یہ تو غلط ہے اور عورتوں کو پردہ نہ کرایا جائے تو انہیں عورت کہنے کے خلاف ہے، کیونکہ عورت کہنا، خود دلیل ہے اس بات کی کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیز ہے۔

اور اس کے علاوہ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ پردہ، تعلیم کے لیے مضر ہے۔ اس کا جواب حضرت والا نے دیا ہے کہ تعلیم حاصل کرنے میں پردہ یا بے پردگی کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ اس میں بڑا دخل "توجہ" کو ہے۔ اگر کسی قوم کی عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں، وگرنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا، بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے اور عورتوں کا پردہ میں رہنا، تعلیم کے حصول کے لیے مددگار تو ہے، لیکن رکاوٹ نہیں ہے۔ پتہ نہیں کیا وجہ ہے کہ لوگوں کی عقلیں کیوں کام نہیں کرتیں، جو پردہ کو تعلیم کے منافی سمجھتے ہیں۔

حضرت والا نے پردہ کی اہمیت پر قرآن سے دلیل بیان کی ہے۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے قرآن میں "مردوں کو یہ حکم فرمایا: "قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ" (مؤمنین سے آپ کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں) اور عورتوں کے لیے، یہ بھی حکم فرمایا اور اس پر اضافہ فرمایا: "وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ" (بناؤ سنگھار کو ظاہر نہ کریں) اور ظاہر سی بات ہے کہ بناؤ سنگھار کی جگہ تو واضح اور کھلی ہوتی ہے۔ اسی لیے تو عورتیں بناؤ سنگھار کرتی ہیں، جب اس کا اظہار اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا ہے تو باقی بدن کا اظہار کیسے جائز ہو گا؟" (اشرف الجواب: 358، مکتبہ عمر فاروق)

اِس آیت سے پردہ کا واضح ثبوت ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ پردہ شریعتِ مطہرہ کی طرف سے حکم ہے، جسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ " اے جوان عورتو! تمہیں کیسے اجازت ہو سکتی ہے، کہ دور دور کے رشتے داروں کے سامنے بے پردہ ہو کر آجاؤ؟ اور حضور ﷺ سے زیادہ افضل تو کوئی انسان نہیں ہے، پھر بھی آپ ﷺ، اپنے آپ سے، عورتوں کو پردہ کرواتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو جاہل لوگ کہتے ہیں کہ پردہ ضروری نہیں ہے اور ایسا پردہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے، محض غلطی ہے، بات یہ ہے کہ اُن لوگوں نے قرآن وحدیث کو دیکھا ہی نہیں، بس دیکھا ہے تو کوئی اخبار دیکھ لیا! اگرچہ پڑھی عربی ہے، لیکن دیکھا مصری اخبار ہے۔ لہٰذا یہ بات سمجھ لیں کہ یہ پردہ جو آج کل مروّجہ ہے یہ قرائن (علامات) سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی ثابت ہے۔" (اشرف الجواب: 358، مکتبہ عمر فاروق)

اور پردہ کے متعلق یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ پردہ میں بھی سب کچھ ہو جاتا ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیا پردہ داروں میں زنا نہیں ہوتا؟

حضرت والا نے اس کا جواب دیا ہے کہ "جب کبھی بھی ایسا کچھ ہوا ہے، وہ بے پردگی ہی کی وجہ سے ہوا ہے اور اکثر تو یہ ہے کہ جن لوگوں میں ایسے واقعات ہوئے ہیں، اُنہیں پردہ دار کہنا ہی برائے نام ہے، ورنہ اُن کے ہاں بھی پردہ نہیں کیا جاتا، کیونکہ یہ کام تو تب ہوا ہے جب پردہ نہیں تھا اور ایسی حالت میں ان کو پردہ دار کہنا ایسا ہے، جیسے کوئی معزز اور محترم آدمی، جُوا کھیل کر یا شراب پی کر، جیل خانہ میں چلا جائے، تو اسے کوئی کہے کہ بڑے معزز صاحب، جیل خانے میں آئے ہوئے ہیں اور یہ غلط ہے، کیونکہ معزز اور محترم، تبھی جیل میں پہنچے گا جب وہ عزت والے کام چھوڑ دے گا اور اُسے معزز کہنا، صرف خاندان کی شرافت کی وجہ سے ہے، وگرنہ عزت تو رخصت ہو چکی ہے۔ اسی طرح پردہ داروں سے جو زِنا کا فعل سرزد ہوتا ہے اور پھر انہیں پردہ دار کہنا رسم کے طور ہوتا ہے، کیونکہ اس بُرے فعل کی نوبت، پردہ نہ کرنے کی وجہ سے آئی ہے۔" (خطباتِ حکیم الامت:18/158، تالیفاتِ اشرفیہ)

حاصل یہ کہ غلطی پر وہ لوگ ہیں جو پردہ کے مخالف ہیں اور یہ بات محض خام خیالی ہے کہ زنا سے حفاظت، بغیر پردہ کیسے ہو سکتی ہے۔ جب شریعت، پردہ کو زنا کی حفاظت کے لیے ضروری سمجھتی ہے اور تدبیر واحتیاط کی ضرورت سمجھتی ہے تو پھر اِس کا مطلب ہے کہ واقع میں یہ مشکل کام ہے۔ شریعت کی نظر ہم سے زیادہ گہری ہے اور شریعت کے سامنے ہماری تحقیق کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

پردہ کا عقلی ثبوت:

بعض کم عقل لوگ پردے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں بقسم کہتا ہوں کہ پردہ نہ کرنے کی وجہ سے، شریعت کی مخالفت تو ہے ہی (جو کہ گناہ کا سبب ہے) اس کے علاوہ اتنی خرابیاں ہیں کہ آج جو عقلاء پردہ کی مخالفت کرتے ہیں اور پردہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، ان خرابیوں کو دیکھ کر بعد میں وہ خود ہی تجویز کریں گے کہ پردہ ضرور ہونا چاہیے، مگر اس وقت بات قابو سے نکل چکی ہوگی، اب تو بنی بنائی بات ہے، اسے بگاڑنا نہیں چاہیے، پھر پچھتائیں گے اور کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔

اس سے بڑھ کر پردہ کو کوئی خلافِ فطرت کہتا ہے، کوئی قید اور حبس کہتا ہے۔ ایک مسلمان انجینئر سے ایک پادری انجینئر نے کہا کہ مسلمانوں کا مذہب بہت اچھا ہے، اس میں سب خوبیاں ہیں، مگر عورتوں کو قید میں رکھا جاتا ہے۔ مسلمان انجینئر نے کہا: کہاں! ہم نے تو کسی مسلمان عورت کو قید میں نہیں دیکھا، پادری نے کہا: وہی قید تو ہے جسے تم پردہ کہتے ہو، تو مسلمان انجینئر نے کہا کہ آپ بتاؤ کہ قید کسے کہتے ہیں؟ پھر خود ہی کہنے لگا کہ حقیقت یہ ہے کہ قید، خلافِ طبیعت حبس کو کہتے ہیں اور جو خلافِ طبیعت نہ ہو، وہ قید نہیں ہوتی۔ وگرنہ قضائے حاجت (واش روم) کے لیے جو پردہ کیا جاتا ہے، اسے بھی قید کہنا چاہیے، کیونکہ اس وقت انسان سب کی نظروں سے اوجھل بھی ہو جاتا ہے اور الگ بھی ہو جاتا ہے، مگر کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ ہم اتنی دیر قید میں رہے ہیں، لیکن اگر کسی کو زبردستی (واش روم) میں بند کر دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ خبردار! یہ آدمی یہاں سے نکلنے نہ پائے، تو اس صورت میں بیشک یہ حبس اور قید، خلافِ طبیعت ہے اور یہ ضرور قید ہے۔ ان دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں حبس، خلافِ طبیعت نہیں ہے اور دوسری صورت میں خلافِ طبیعت ہے۔ اب پہلے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں، جو پردہ میں رہتی ہیں، پردہ اُن کی طبیعت کے موافق ہے یا مخالف؟ اگر موافق ہے تو پھر یہ پردہ قید نہیں ہے۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ پردہ مسلمان عورتوں کے لیے خلافِ طبیعت نہیں ہے، کیونکہ مسلمان عورتوں کے لیے حیاء، امر طبعی (طبیعت کے موافق) ہے۔ اس لیے پردہ طبیعت کے موافق ہے اور اسے قید کہنا غلط ہوگا اور عورتوں کی حیاء کا تقاضا یہی ہے کہ وہ پردہ میں رہیں، لیکن اگر اُنہیں باہر پھرنے پر مجبور کیا جائے اور پردہ نہ کرایا جائے، تو یہ اُن کی طبیعت کے خلاف ہے اور یہ اُن کے لیے قید ہے۔

(اشرف الجواب:595، مکتبہ عمر فاروق)

تَمَّتْ بِالْخَيْر

مراجع و مصادر

نمبر شمار	کتاب	مصنف و مؤلف
1	الصحیح البخاری	امام محمد بن اسماعیل البخاریؒ
2	الصحیح لمسلم	امام ابوالحسن مسلم بن الحجاجؒ
3	سنن ابی داؤد	امام ابوداؤد سلیمان بن الاشعثؒ
4	سنن الترمذی	امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ
5	سنن ابنِ ماجہ	ابوعبداللہ محمد بن یزید القدوینی ابنِ ماجہؒ
6	تفسیر بیان القرآن	مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ
7	اشرف السوانح	حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ
8	حضرت تھانویؒ کا طریقۂ اصلاح	ڈاکٹر سید ابرار علی صاحب
9	تربیت السالک	مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ
10	اشرف الجواب	مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ
11	خطباتِ حکیم الامت	مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ
12	ملفوظاتِ حکیم الامت	مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ
13	احکامِ اسلام عقل کی نظر میں	مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ
14	اسلام اور سیاست	شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ
15	حیوٰۃ المسلمین	مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ
16	بہشتی زیور	مولا اشرف علی تھانوی صاحبؒ